مقدمہ سطعات

احوال و آثار

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

از

مولانا سید متین ہاشمی

پیشکش: طوبیٰ ریسرچ لائبریری

الٰہی انت مقصودی و رضاک مطلوبی

سطعات

تصنیف حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

مولانا سید محمد متین ہاشمی

ادارہ ثقافت اسلامیہ

بسمِ اللهِ الرّحمٰنِ الرّحیمِ ۵

انتساب

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ

کے نام

جن کے افکار کی روشنی میں میں نے فلسفۂ ولی اللٰہی
کو سمجھنے کی کوشش کی ہے

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہِ الکریم

مقدّمہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ سوانح اور افکار و خدمات

اس میں کوئی شک نہیں کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اپنے دورِ حکومت میں اکبری عہد کے الحاد اور اباحیت کا قلع قمع کر دیا تھا اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے خانوادہ گرامی کے زیر اثر ہندوستان میں ایسی صورتِ حال پیدا کر دی تھی کہ اگر اس کے جانشین ذرا بھی ہوش و گوش سے کام لیتے تو اس ملک میں نہ ان کے اقتدار کو زوال لاحق ہوتا اور نہ معتقدات کو۔ لیکن اورنگ زیب کے جانشین عیش کوش، دون ہمت اور حکمرانی کی تمام اعلیٰ صلاحیتوں سے عاری نکلے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی وفات ہوتے ہی فتنوں کا جیسے آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا۔ ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ اقتدار کی باہمی کشاکش، سازشوں پر سازشیں اور امرا کی دھڑے بازیاں شروع ہو گئیں۔ پھر تو ایسا خونی انقلاب آیا کہ دلّی خون میں نہا گئی۔ نادر شاہ شامتِ اعمال بن کر نازل ہوا اور اس نے دلی کے سہاگ کی چادر کو تار تار کر دیا۔ مرہٹوں کی تاخت و تاراج، جاٹوں کی لوٹ مار اور سکھوں کے مظالم کی داستانیں آج بھی مورخ کو خون کے آنسو رلاتی ہیں۔ مسلمان ان تمام قوتوں کا بہ آسانی مقابلہ کر سکتے تھے۔ لیکن اس کو کیا کیجیے کہ باہمی افتراق و تشتت نے ان کے سارے قوائے عملی کو مفلوج کر رکھا تھا۔ وہ زندگی کے سنگین حقائق سے بے بہرہ، توہمات کے بندھنوں کے اسیر، جہالت کی دیوی کے پجاری اور ہوائے نفسانی کے غلام بنے ہوئے تھے۔

مسجدیں ویران تھیں، خانقاہوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا، محل سازشوں کے آماجگاہ اور عیاشیوں اور ہوس پرستی کے مراکز بنے ہوئے تھے۔ مغلوں کے اقتدار کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ صرف ایک جھونکے کا انتظار تھا۔ ان حالات کو دیکھ کر انگریزوں، پرتگالیوں اور

فرانسیسیوں کی حرص آلود نگاہیں ہندوستان پر پڑ رہی تھیں۔ غرضکہ ہر طرف تاریکی تھی ــــ ایک بھیانک تاریکی، نشانِ منزل گم اور چراغِ راہ بجھا ہوا۔

ان حالات میں اورنگ زیب کی وفات سے ٹھیک چار سال قبل ۴ شوال۔ بروز چہارشنبہ ۱۱۱۴ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۳ء) کو دہلی کے ایک صاحبِ نسبت اور فخرِ روزگار خانوادے میں حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے گھر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ولادت ہوئی۔

شاہ عبدالرحیمؒ

اگرچہ جو شہرت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو حاصل ہوئی وہ ان کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کو حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ شاہ ولی اللہ کی تعلیم و تربیت اور ان کے عالی افکار کی نمود میں حضرت شاہ صاحب کی فطری صلاحیتوں کے علاوہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ شاہ عبدالرحیمؒ کے والد شاہ وجیہ الدینؒ ایک صاحبِ دل اور صاحبِ سیف بزرگ تھے۔ ۱۰۵۴ھ میں شاہ عبدالرحیمؒ کی ولادت ہوئی۔ آپؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر پائی اور آگرہ میں (جہاں ان کے والد بسلسلہ ملازمت مقیم تھے) میر محمد زاہد ہروی سے معقولات اور علم کلام کی تحصیل کی۔ آپؒ ایک بلند پایہ عالم، محرمِ راز صوفی اور صاحبِ بصیرت فقیہ و محدث تھے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ آپ کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جو عام علوم میں عموماً اور فقہ و حدیث میں خصوصاً ان کی طرح تبحر رکھتا ہو (بحوالہ رودِ کوثر ص ۴۹۷)

آپؒ کی روحانی تربیت میں سب سے زیادہ حضرت خواجہ حافظ سید عبداللہؒ خلیفہ حضرت آدم بنوریؒ کو دخل تھا۔ حضرت آدم بنوریؒ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے جلیل القدر خلفا میں تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے انفاس العارفین میں لکھا ہے کہ جب شیخ آدم بنوریؒ کی شہرت عام ہو گئی تو شاہ جہان بادشاہ نے اپنے وزیر سعد اللہ خان اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کو حضرت شیخ کے پاس بھیجا تاکہ شیخ سے مل کر حقیقتِ حال کا پتہ کریں۔ جس وقت یہ دونوں شیخ آدم بنوریؒ کے پاس پہنچے وہ مراقبہ میں تھے۔ وہ کافی دیر تک مراقب رہے اور یہ لوگ حجرے کے باہر انتظار کرتے رہے چنانچہ

جب وہ فارغ ہوئے تو ان لوگوں نے شیخ سے ملاقات کی۔ شیخ ان لوگوں کی تعظیم بجا نہ لائے، جس سے سعد اللہ کا مزاج بگڑ گیا اور اس نے واپس جا کر شاہ جہان کو شیخ کے خلاف بھڑکا دیا۔ اس نے شیخ کو پیغام دیا کہ وہ فوراً حج کو چلے جائیں۔ شیخ انتہائی عجلت میں عازمِ مکہ ہوئے۔ سورت کا حاکم آپ کا ارادت مند تھا۔ اس نے آپ کے لیے جہاز کا انتظام کر دیا اور آپ جہاز پر سوار ہو گئے۔ جب آپ جہاز پر سوار ہو گئے تو بادشاہ کا حکم پہنچا کہ اس فقیر کو جلد واپس لوٹاؤ کیونکہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ اس درویش کا باہر جانا میرے ملک کے زوال کا باعث بنے گا۔ حاکم سورت نے معذرت لکھ دی کہ فرمان شاہی پہنچنے سے پہلے شیخ جہاز پر سوار ہو گئے۔ چنانچہ اسی کے بعد بادشاہ قید ہوا۔ جس وقت حضرت آدم بنوریؒ روانہ ہو رہے تھے حضرت حافظ سید عبداللہ نے بھی اپنے شیخ کے ساتھ جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس وقت حضرت آدم بنوریؒ نے فرمایا کہ "مصلحت اس میں ہے کہ تم یہیں قیام کرو۔ اس کا علم تمھیں بعد میں ہوگا۔"

حضرت شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں کہ "مجھ سے اکثر حافظ سید عبداللہ فرمایا کرتے تھے کہ آج مصلحت کا پتہ چل گیا۔ دراصل مقصود یہ تھا کہ تمھاری تربیت میرے ذریعہ ہو۔" حضرت حافظ سید عبداللہؒ نے اپنے فیضِ صحبت سے شاہ عبدالرحیم کو کندن بنا دیا تھا۔ یہ اس لیے کہ وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسے نامور فرزند (جو مستقبل میں امام الہند بننے والے تھے) کی تربیت کر سکیں۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ نے بڑی جان سوزی اور شفقت سے حضرت شاہ ولی اللہ کی تربیت فرمائی اور انھیں جو کچھ بارگاہِ اولیاء سے ملا تھا، سب کا سب اپنے گرامی قدر صاحب زادے کے باطن میں انڈیل دیا۔

بشارت فرزند

حضرت شاہ ولی اللہ نے انفاس العارفین اور اپنی خود نوشت سوانح "جز لطیف" میں لکھا ہے کہ "والدین قدس سرہما اور کئی دیگر صلحا کو میری پیدائش سے پہلے اور اس کے بعد بشارتیں ہوئیں۔" انفاس العارفین میں تحریر فرماتے ہیں کہ "ایک مرتبہ میں (شاہ عبدالرحیمؒ) حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار کی زیارت کے لیے گیا۔ آپؒ کی روح مبارک ظاہر ہوئی اور مجھے فرمایا کہ تمھیں ایک فرزند عطا ہوگا اس کا نام قطب الدین احمد رکھنا۔ اس وقت میری زوجہ عمر کے اس حصہ کو پہنچ چکی تھیں جس

یں اولاد کا پیدا ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید اس سے مراد بیٹے کا فرزند یعنی پوتا ہے۔ میرے اس وہم پر آپ فوراً مطلع ہو گئے اور فرمایا میرا مقصد یہ نہیں ہے، بلکہ یہ فرزند (جس کی بشارت دی گئی ہے) خود تمھاری صلب سے ہو گا۔ کچھ عرصہ بعد دوسرے عقد کا خیال پیدا ہوا، اور اسی سے کاتب الحروف ولی اللہ پیدا ہوا میری پیدائش کے وقت والد ماجد کے ذہن سے یہ واقعہ اتر گیا، اس لیے انھوں نے ولی اللہ نام رکھ دیا۔ کچھ عرصہ بعد جب انھیں یہ واقعہ یاد آیا تو انھوں نے میرا دوسرا نام قطب الدین احمد رکھا" (انفاس العارفین ص۱۱۱ ترجمہ المعارف لاہور ۱۳۹۴ھ سید محمد فاروق القادری)

شاہ عبدالرحیم بڑے ذی علم اور دیدہ ور بزرگ تھے۔ انفاس العارفین سے پتا چلتا ہے کہ فقہ کی عظیم کتاب "فتاویٰ عالمگیری" کی تدوین کرنے والی جماعت کے بھی کچھ دنوں تک رکن رہے تھے۔ ساتھ ہی تصوف و طریقت کے بھی رمز آشنا تھے۔ فقہ و تصوف کے امتزاج نے شاہ عبدالرحیم کے مزاج میں غیر معمولی اعتدال پیدا کر دیا تھا۔ اس اعتدال پسندی کی وجہ سے ان میں جامعیت پیدا ہو گئی جو آگے چل کر شاہ ولی اللہ کے کردار کی تعمیر میں خشتِ اول کی حیثیت سے شامل ہوئی۔ شاہ عبدالرحیم کی طبیعت کی دوسری اہم ترین خصوصیت شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں یہ تھی "حضرت ایشاں با اخلاق سلیمہ مرضیہ از شجاعت و فراست و کفایت و غیرت بوجہ اتم موصوف بودند و عقل معاش مثل عقل معاد کامل و وافر داشتند و در مجلس صحبت حکمت عملی و آداب معاملہ بسیار می آموختند"

"عقل معاش و عقل معاد" کا یہ اجتماع شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اور جب کبھی ہو جایا کرتا ہے تو پھر انسان صحیح معنوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث اور اس کی زندگی ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار کی تفسیر ہوتی ہے۔ شاہ عبدالرحیمؒ نے شاہ ولیؒ اللہ کی تربیت میں اس امر کو خصوصی طور پر ملحوظ رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب حضرت شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی فکری قیادت کی زمام اپنے ہاتھ میں لی تو انھوں نے دونوں میدانوں کے لیے ایک جامع لائحہ عمل تجویز فرمایا۔

شاہ ولیؒ اللہ کی تعلیم و تربیت

اپنی خود نوشت سوانح میں حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"پانچ سال کی عمر میں مکتب میں بیٹھا اور سات سال کا تھا کہ والد بزرگوار نے مجھے نماز کے لیے کھڑا کر دیا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا ختنہ بھی اسی سال ہوا اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے قرآن مجید بھی اسی سال ختم کر کے عربی، فارسی کی کتابیں شروع کیں۔ دس برس کا تھا تو شرح ملا پڑھتا تھا۔ اسی دوران مجھ پر مطالعہ کی راہ کھلی۔ چودہ برس کی عمر میں میری شادی ہو گئی۔ والد بزرگوار کو میری شادی کے بارے میں بڑی جلدی تھی.......

پندرہ برس کی عمر میں والد بزرگوار سے بیعت کر کے اشغال صوفیا خصوصاً مشائخ نقشبندؒ کے اشغال میں مصروف ہو گیا اور ان کی توجہ و تلقین سے بہرہ ور ہوتے ہوئے ان سے آداب طریقت کی تعلیم اور خرقۂ صوفیا حاصل کر کے اپنے روحانی سلسلے کو درست کر لیا۔ اسی سال بیضاوی شریف کا کچھ حصہ پڑھا تو اس موقع پر والد بزرگوار نے ایک عام دعوت کا اہتمام کیا اور درس کی اجازت عطا فرمائی۔ خلاصہ یہ کہ اس علاقے کے تمام علوم متداولہ سے پندرہ برس کی عمر میں فراغت حاصل کر لی........ اس حصول علم کے دوران ہر فن کے کئی قیمتی نکات میرے ذہن میں پیدا ہوتے تھے جو مزید غور و فکر سے کئی اور راہیں سمجھا دیتے ہیں اپنی عمر کے سترھویں برس میں تھا کہ والد بزرگوار بیمار پڑ گئے اور اسی علالت میں رحمتِ خداوندی کی آغوش میں چلے گئے۔ آپؒ نے مرض الموت کے دوران مجھے بیعت و ارشاد کی اجازت عطا فرمائی اور یہ جملہ کہ یدہٗ کیدی (اس کا ہاتھ میرا ہاتھ ہے) دو بار ارشاد فرمایا۔ میرے نزدیک سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ والد بزرگوار ساری زندگی مجھ سے راضی رہے اور اسی عالم میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ مجھ پر ان کی اس قدر توجہ تھی کہ کسی باپ کو اپنے بیٹے پر نہیں ہو سکتی۔ میں نے کسی ایسے والد، استاد یا مرشد کو نہیں دیکھا کہ جو اپنے فرزند، شاگرد اور مرید کے ساتھ ایسی شفقت سے پیش آتا ہو جس شفقت کے ساتھ والد بزرگوار مجھ سے پیش آتے تھے (بحوالہ بالا از ص۲۰۴ تا ص۲۰۵)

عرصہ تدریس

حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کی وفات کے بعد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی مسندِ درس پر رونق افروز ہوئے اور کم و بیش بارہ سال تک دینی و عقلی کتب کی تدریس میں مصروف رہے اور ہر علم میں خاصا درک حاصل کیا۔ فرماتے ہیں۔

"بعد از وفات حضرت ایشاں دوازدہ سال کم و بیش بدرس کتب دینیہ و عقلیہ نمودہ و در ہر علمے خوض واقع شد"۔ (الجزء اللطیف)

سفر حرمین شریفین

کم و بیش بارہ سالہ تدریس کے بعد حضرت شاہ صاحب کے دل میں حرمین شریفین کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ ۱۱۴۳ھ میں حضرت شاہ صاحب سفرِ حج پر روانہ ہو گئے۔ حضرت شاہ صاحب کا یہ سفر معمولی نہیں تھا۔ راستے نہایت غیر محفوظ تھے۔ اس وقت بحرِ ہند، بحرِ عرب اور بحرِ احمر کے تمام سواحل پرتگیزی، فرانسیسی اور انگریز تاجروں اور قزاقوں کی ترکتازیوں کی جولان گاہ بنے ہوتے تھے۔ علانیہ حاجیوں کے جہازوں کو لوٹ لیا جاتا اور ان کی کوئی داد فریاد نہیں تھی۔ سورت کے ساحل تک پہنچنا بھی کوئی کھیل نہیں تھا۔ صوبجات متوسط، مالوہ اور گجرات کے علاقے مرہٹوں کی لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی زد میں تھے۔ ایسے حالات میں حضرت شاہ صاحبؒ کا رختِ سفر باندھ لینا معمولی بات نہیں تھی۔ یہ سب کچھ آپ کے بے پایاں شوق اور عزیمت صادقہ کا کرشمہ تھا جس نے آپ کو ان موانع کے مقابلے میں کوہِ گراں کا ثبات بخش دیا تھا۔ کوئی تھا جو اشارے کر رہا تھا اور کوئی تھا جو کشاں کشاں چلا جا رہا تھا۔

ہر دو بہ منزلے رواں ہر دو امیر کارواں
عقل بحیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

الغرض شاہ صاحب بحفاظت تمام منزلِ مقصود پر پہنچ گئے اور آپ نے فریضۂ حج ادا کیا۔ ۱۱۴۳ھ کا حج ادا کرنے کے بعد آپ ایک سال تک حرمین شریفین میں اقامت پذیر

رہے اور اس عرصہ میں آپؒ نے حرمین کے اساتذہ سے علمی استفادہ کیا۔ آپ کا زیادہ تر قیام مدینہ منورہ میں رہا۔ خود حضرت شاہ صاحب کی زبانی حرمین شریفین کے قیام کی مختصر روداد سنیے :

"۱۱۴۳ھ کے اواخر میں حج کی سعادت سے مشرف ہوا، اور ۱۱۴۴ھ میں مجاورت مکہ معظمہ، زیارت مدینہ منورہ، شیخ ابوطاہر قدس سرہٗ اور دوسرے مشائخ حرمین سے روایت حدیث کا شرف حاصل کیا۔ اسی دوران حضرت سید البشر علیہ افضل الصلوٰۃ و اتم التحیات کے روضۂ اقدس کو مرکزِ توجہ بنا کر فیوض حاصل کیے۔ علمائے حرمین اور دیگر لوگوں کے ساتھ دلچسپ صحبتیں رہیں اور شیخ ابوطاہر سے خرقہ جامعہ حاصل کیا، جو بلاشبہ تمام سلاسل کے خرقوں کا جامع ہے۔ اسی سال کے اخیر میں فریضۂ حج ادا کیا۔ ۱۱۴۵ھ میں عازمِ وطن ہوا، اور اسی سال بروز جمعہ ۱۴ رجب المرجب صحیح و سالم وطن پہنچ گیا"۔ (انفاس العارفین ترجمہ ص۴۰۶)

شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی المدنی

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے رسالہ "انسان العین فی مشائخ الحرمین" میں اپنے ان تمام اساتذہ اور مشائخ کا مبسوط تذکرہ پیش کیا ہے جن سے آپ نے حرمین شریفین کے قیام کے دوران سندِ حدیث یا خرقۂ صوفیہ حاصل کیا۔ لیکن حضرت شاہ صاحب کے افکار کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے والا ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ مشائخ حرمین میں سب سے زیادہ حضرت شاہ صاحبؒ شیخ ابوطاہر مدنیؒ سے متاثر ہوئے اور شیخ موصوف نے بھی اس جوہرِ قابل کی فطری استعدادات کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا۔ اسی لیے وہ فرمایا کرتے کہ :

"وہ (شاہ ولی اللہ) ہم سے لفظوں کی سند لیتے ہیں اور ہم ان سے حدیثوں کے معانی و مطالب کی تصحیح کرتے ہیں"۔

(الیانع الجنی تالیف مولانا محسن بہاری)

حضرت شاہ صاحب شیخ ابوطاہر مدنیؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"الغرض آپ سلف صالحین کے تمام اوصاف مثلاً تقویٰ، عبادت، علمی شغف،

اور بحث و تمحیص میں انصاف پسندی سے متصف تھے۔ جب آپ سے کسی مسئلے کے بارے میں رجوع کیا جاتا تو جب تک پورا غور و فکر اور کتابوں سے اس کی تحقیق نہ کر لیتے جواب نہ دیتے۔ آپ اس قدر رقیق القلب تھے کہ جب بھی کوئی اس طرح کی حدیث پڑھتے تو آنکھیں پُرنم ہو جاتیں۔ لباس وغیرہ میں کوئی تکلف نہ برتتے، اپنے تلامذہ اور خدام سے بھی تواضع سے پیش آتے۔"

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فلسفے کی اساسیات میں اہم ترین اساس الجمع بین المختلفات (یعنی اختلافات کو کم کرنا اور ہر اختلافی مسئلہ میں قدر مشترک کو تلاش کر کے دو متضاد و باہم متخالف آرا کو جمع کر دینا) ہے۔ غالباً حضرت شاہ صاحب کا ذہن اس اصول کی طرف شیخ ابو طاہر مدنیؒ کے طریق فکر کی وجہ سے منتقل ہوا۔ حضرت شاہ صاحب شیخ موصوف کے بارے میں اپنے رسالہ "انسان العین فی مشائخ الحرمین" میں فرماتے ہیں۔

"صحیح بخاری کی قرأت کے دوران جب روایات احادیث اور فقہ کے اختلافات سامنے آتے تو شیخ ابو طاہرؒ فرماتے کہ یہ تمام اختلافات سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی جامعیت (جامعیت کبریٰ) کا نتیجہ ہیں۔ جو اپنے اندر کونین کی تمام تر اضداد و موافقات سموئے ہوئے ہے۔ راقم الحروف (شاہ ولیؒ اللہ) کہتا ہے کہ یہ ایک نہایت گہرا نکتہ ہے۔ جس پر تدبر کی ضرورت ہے۔

فقہا و صوفیا کے مابین آویزش بہت پرانی ہے۔ ایک گروہ ضرورت سے زیادہ ظاہری عبادات و احوال پر زور دیتا ہے جب کہ دوسرا باطنی کیفیات و واردات پر، جس کے نتیجے میں خواہ مخواہ کی کشاکش شروع ہو جاتی ہے۔ شیخ ابو طاہر مدنیؒ فقہ و تصوف کے جامع تھے اور دونوں گروہوں کا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"ایک دن احوال صوفیا اور ان کی باہمی تنقید و تردید جو بعض دفعہ ان کے پیروکاروں میں بھی چل پڑتی ہے، پر گفتگو چھڑ گئی تو شیخ ابو طاہرؒ نے فرمایا کہ میں صوفیا کے بارے میں کچھ کہنے سے بہت ڈرتا ہوں۔ اگرچہ میرے بعض اسلاف بعض صوفیا کے بارے میں ناقدانہ رائے رکھتے تھے۔ مگر جہاں تک میرا تعلق ہے میرے دل میں ان کے لیے تردید و تنقید کا معمولی جذبہ بھی موجود نہیں ہے۔"

حضرت شاہ صاحبؒ شیخ ابو طاہرؒ مدنی کے اس رویہ سے بھی متاثر ہوتے اور ساری زندگی، ؎

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق

کا نمونہ بنے رہے۔

حرمین شریفین سے واپسی

بالآخر جدائی کی گھڑی آ پہنچی

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

حضرت شاہ صاحبؒ نے حرمین سے واپسی کے لیے رختِ سفر باندھ لیا اور اپنے محبوب ترین استاد شیخ ابو طاہر مدنیؒ کی خدمت میں الوداعی سلام کے لیے حاضر ہوئے تو بے اختیار آپ کی زبان پر یہ شعر آ گیا۔

نسیت کل طریق کنت اعرفہ
الا طریقا یؤدینی الیٰ ربعکم

(یعنی میں بجز اس راستہ کے جو تمھارے گھر تک لے جانے والا ہو سب راستوں کو بھول گیا)

یہ شعر سنتے ہی شیخ صاحب کی نمناک آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہنے لگیں اور دونوں رخسار سرخ ہو گئے۔ یہاں تک کہ وفور گریہ سے آپ کا گلا رندھ گیا۔ اس کے بعد شیخ ابو طاہرؒ نے بڑے الحاح و زاری کے ساتھ حضرت شاہ صاحبؒ کے حق میں دعا کی۔ باطنی فیوض تلقین کیے اور آپ پر ان تمام رموز و اسرار منکشف کر دیے جو عرصہ دراز سے آپؒ کے سینے میں محفوظ تھے۔

استاد کو الوداع کہہ کر حضرت شاہ صاحبؒ عازم ہندوستان ہوئے اور ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ (۹ جولائی ۱۷۳۲ء) بروز جمعہ وطن پہنچے۔

وطن پہنچ کر شاہ صاحب نے اور ہی سماں دیکھا۔ ہر طرف ابتری، بے راہروی، اختلاف، افتراق، ہرمٹہ گردی، لوٹ مار، قتل و غارت اور تباہی و بربادی کے

بھیانک مناظر۔ ایسے حالات میں حضرت شاہ صاحبؒ کا متاثر ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ آپ تارک الدنیا راہب نہیں تھے کہ گردوپیش سے آنکھیں بند کرکے اپنے تصوّرات کی دنیا میں کھو جاتے۔ آپ کے سینے میں ایک دردمند دل دھڑک رہا تھا اور آپ کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت مبارکہ اور حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کا اسوہ تھا۔ اب حضرت شاہ صاحب کے لیے دو ہی راستے تھے یا تو تلوار ہاتھ میں لے کر میدانِ عمل میں اُتر پڑتے اور نعرۂ جہاد بلند کرکے اہل باطل کو مٹا دیتے یا پھر قلم سنبھال کر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی خلافت باطنی کے فرائض انجام دیتے۔ اول الذکر صورت ممکن نہیں تھی اس لیے کہ قوم بے جان ہو چکی تھی، باہمی اختلافات نے ملّت کا شیرازہ منتشر کر دیا تھا، امرا کی باہمی چپقلش اور دسیسہ کاری کا مقابلہ کرنا کھیل نہیں تھا۔ ہاں دوسری صورت حضرت شاہ صاحب کے بس میں تھی، چنانچہ آپ نے قلم ہاتھ میں لیا اور قرآن وسنت کی صحیح تشریح، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور دین متین کی تعلیمات سے لوگوں کو آشنا بنانا شروع کیا۔ خلافت ظاہری یعنی جہاد بالسیف کے لیے جو لوگ زیادہ موزوں تھے حضرت شاہ صاحب نے ان کو جھنجوڑا اور ان کی ہمت افزائی فرمائی۔ التفہیمات الالٰہیہ میں آپ کے وہ سارے خطابات درج ہیں جن میں آپ نے بادشاہوں، سپاہیوں، ارکان دولت، اہل صنعت وحرفت، پیرزادگان، غلط کار علما، زاہدان خشک، عوام الناس، واعظانِ تنگ نظر کو مخاطب فرما کر انھیں عمل صالح پر اُبھارا ہے، ان کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور مرض کا علاج تجویز فرمایا ہے۔ آپؒ ہی نے احمد شاہ ابدالی کو بلا کر مرہٹوں کا استیصال کرایا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے "شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکاتیب" میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ "پانی پت کا میدانِ کارزار حقیقت میں شاہ ولی اللہؒ کا سجایا ہوا تھا۔"

سفرِ حج سے پہلے حضرت شاہؒ صاحب کا زیادہ تر مشغلہ درس وتدریس تھا لیکن اس سفر سے واپسی کے بعد آپ نے تدریسی مشاغل کم کر دیے۔ صرف حدیث کا درس دیتے اور باقی وقت کو تصنیف تالیف میں لگاتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؒ کے مزاج کو معتدل بنایا تھا اس لیے بیمار بھی کم پڑتے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ آپ کا حافظہ غضب کا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ چند سالوں میں آپؒ نے جلیل القدر تصانیف مرتب فرما دیں جن کے سہارے

برِصغیر کے مسلمان دورِ زوال میں بھی اپنے اسلاف کے افکار کو محفوظ رکھنے اور ان کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کے قابل ہوئے۔ برطانوی سامراج کے دورِ حکومت میں عقلیت پسندی اور مغربیت کا جو خوفناک ریلا آیا اور جس نے اکثر اسلامی ممالک کی دینی اقدار وروایات کے محل کو منہدم کر دیا، برِصغیر کے مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور شاہ ولیؒ اللہ کے تیار کیے ہوئے پشتے سے ٹکرا ٹکرا کر واپس لوٹ گیا۔

وفات

آپؒ کی وفات ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ء) کو دہلی میں ہوئی۔ آپؒ کی تاریخ وفات اس مصرع سے نکلتی ہے۔ او بود امام اعظم دیں

۱۱۷۶ھ

تابکے محنت مہجوری و دوری بکشم — ناز نین وطنم سوئے وطن باز روم
تابکے ہمدیٔ سنگ بود شیوۂ من — گوہرے از عدنم سوئے عدن باز روم
تابکے بستۂ زنجیر تعلق باشم — آہوئے از ختنم سوئے ختن باز روم
بوئے جاں میرسد از یار یمن زدہ جاں — شاہ ملک یمنم سوئے یمن باز روم

(شاہ ولیؒ اللہ)

اخلاق وعادات

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو قدرت نے ابتدا ہی سے حکیمانہ مزاج اور مومنانہ اخلاق کا حامل بنایا تھا۔ چنانچہ آپ بچپن ہی سے نرم خو، بردبار، سنجیدہ، خوش اخلاق، ستودہ صفات، منکسر، پاکیزہ اطوار، متقی اور ملنسار تھے۔ آپ نے عام بچوں کی طرح بچپن میں بھی کسی بات پر ضد نہیں کی اور نہ اپنا وقت کھیل کود میں ضائع کیا۔ آپ کے مزاج میں اتنی سادگی تھی کہ کبھی کسی خاص کھانے یا کپڑے کی خواہش کا اظہار نہیں فرمایا، جو ملا کھا لیا اور جو میسر آیا پہن لیا اور اپنا زیادہ وقت پڑھنے پڑھانے اور عبادت وریاضت میں گزارا۔

اسی وجہ سے شاہ عبدالرحیمؒ صاحب اپنی ساری اولاد میں حضرت شاہؒ صاحب

کو سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ اکثر اوقات خلوت و جلوت میں انھیں اپنے پاس بٹھاتے اور بڑے تلطف آمیز لہجے میں ان سے گفتگو کرتے۔ بعض وقت جوش میں آتے تو فرمایا کرتے تھے کہ "فرزندِ من! میرے دل میں بے اختیار یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ ایک ہی دفعہ تمام علوم و فنون تمھارے دل میں ڈال دوں"۔ شاہ صاحب کی جوانی فرشتوں کے دامن کی طرح پاک اور بے داغ تھی۔ آپ کے مزاج میں عام جوانوں کی طرح تندی اور تیزی نہیں تھی۔ حکیمانہ ژرف بینی اور عالمانہ کردار جوانی ہی میں پیدا ہو چکا تھا۔ والد بزرگوارؒ کی پاکیزہ تربیت نے آپ کو سیر چشم، مستغنی المزاج اور متوکل علی اللہ بنا دیا تھا۔ آپ کبھی امرا کے دروازے پر نہیں گئے اور نہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کیا۔ آپ ہمہ تن علوم دینیہ کی خدمت میں مصروف رہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی پوری کفالت فرمائی۔ آپ بڑے فیاض اور سخی واقع ہوئے تھے۔ دور دراز علاقوں سے لوگ آپ کے چشمۂ علم سے سیراب ہونے کے لیے آیا کرتے اور آپ سب کے اخراجات کا بار اٹھاتے تھے۔ جو مسافر یا مہمان آتا، آپ اس کی مہمان نوازی انتہائی فراخ حوصلگی اور دریا دلی سے کرتے۔ طالبانِ علم کے لیے تو آپ کا آستانہ پناہ گاہ تھا۔

اگر آپ جان لیتے کہ فلاں شخص حصول علم کے لیے آیا ہے تو اس کے سامنے بچھ جاتے تھے۔ آپ کے مزاج میں غایت درجے کی عاجزی اور انکساری تھی۔ آپ نے علمِ دین کو کبھی رسوا نہیں کیا اور نہ کبھی بھی کوئی ایسا اقدام کیا جس سے علما اور صوفیہ کا وقار مجروح ہو۔ آپ اپنے معمولات میں اتباعِ سنت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ آپ نے ساری زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک کو پیشِ نظر رکھا۔ اگرچہ آپ ایک بلند پایہ صوفی تھے لیکن تارک الدنیا راہب نہیں تھے۔ ملکی حالات و سیاسیات پر آپ کی نظر تھی۔ مسلمانانِ برِصغیر کے مسائل ہر وقت آپ کے پیشِ نظر رہے اور آپ نے ہمیشہ ان کے مسائل کے حل کی راہ نکالی۔ حضرت شاہ صاحب کے کردار کی سب سے اہم خصوصیت آپ کی جامعیت ہے۔ آپ بیک وقت ایک حکیم، نکتہ شناس، ایک صوفیٔ صافی، ایک محدث، ایک مفسر، ایک فقیہ، ایک بے مثال صاحبِ طرز ادیب، انشا پرداز، شاعر، سیاست دان، معقولی، مفکر، معاشیات کے ماہر، عمرانیات کے

رمز آشنا، تاریخ کے غواص، مدبرانہ ذہن کے مالک، مجتہدانہ بصیرت کے حامل اور سب سے بڑھ کر ایک کامل و اکمل انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تھوڑی سی زندگی میں آپ نے علم و معرفت کا وہ باغ سجا دیا جس کی تازگی و شگفتگی میں آج تک کمی نہیں آئی اور نہ ہی قیامت تک کمی آئے گی۔ (ان شاء اللہ العزیز)

علمی کارنامے

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت باطنی کے میدان کو منتخب فرمایا تھا اس لیے آپ نے اپنی ساری سرگرمیاں علمی و فکری شعبوں تک محدود رکھیں۔ آپ نے اپنی خداداد مومنانہ فراست سے آنے والے دور کی مشکلات کا اندازہ لگا لیا اور اپنی تصنیفات میں نہایت ہی واضح الفاظ میں ان کا اسلامی حل پیش کر دیا۔

۱۔ قرآن کریم کی خدمت

برصغیر کے اہلِ علم کی زبان فارسی تھی۔ اسی زبان کو عدالتی زبان ہونے کا فخر حاصل تھا اس لیے لوگ بشوق تمام فارسی زبان سیکھتے۔ اسی میں کتابیں لکھی جاتیں، خط و کتابت ہوتی۔ شاہی فرمان تحریر کیے جاتے۔ غرضکہ ہندوستان کے طول و عرض میں یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے محسوس کیا کہ لوگ قرآن کریم کا احترام تو کرتے ہیں اور اس کی تلاوت بھی کی جاتی ہے لیکن اس کے معانی کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہوتی، جس کے باعث نزول قرآن کا حقیقی مقصد فوت ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ آپ نے قرآن کریم کا ترجمہ "فتح القرآن فی ترجمۃ القرآن" کے نام سے تحریر فرمایا۔

اس ترجمہ کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا اختصار اور جامعیت ہے۔ معرکۃ الآرا اور دقیق سے دقیق مسائل کو آپ نے گنتی کے چند جملوں میں اس خوبصورتی سے بیان فرما دیا ہے کہ انسان حیرت میں پڑ جائے۔ صدیاں گزر گئیں۔ اس عرصے میں سینکڑوں تراجم ہوئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے ترجمہ کو جس مقام پر پہنچا کر چھوڑ دیا مابعد کے مترجمین اس سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے۔ الفاظ نگینے کی

طرح جڑے ہوئے ہیں اور ترجمہ میں بالکل "از دل خیزد بر دل ریزد" والی کیفیت پائی جاتی ہے اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے باہم متحارب و متخالف فرقے اگر کسی ترجمہ پر اتفاق کرتے ہیں تو حضرت شاہ صاحب کے نادر روزگار ترجمے پر۔ ترجمہ پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مترجم کی رُوح میں قرآن پاک اُتر چکا تھا اور وہ اس کے حقیقی مفہوم سے آشنا تھا۔ وہ مضامین جن پر بحث کرتے ہوئے دیگر مفسرین نے صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں، حضرت شاہ صاحب انھیں دو چار جملوں میں ان سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیتے ہیں۔

ترجمہ کے علاوہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اصول تفسیر میں "الفوز الکبیر" جیسی عدیم النظیر کتاب تالیف فرمائی۔

دیکھنے میں تو الفوز الکبیر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ فہم قرآن اور مطالعہ قرآن کے سلسلے میں یہ کتاب سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مطالعہ قرآن کے سلسلے میں جہاں جہاں بھی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں "الفوز الکبیر" وہاں وہاں رہنمائی کرتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ تقریباً ڈھائی سو برس گذر گئے، زمانہ بدل چکا، افکار و نظریات میں انقلابات رونما ہو چکے، نئی نئی تحریکیں اُبھر رہی ہیں۔ اس کے باوجود اس دور کے انسان کی فکری الجھنوں کو دُور کرنے میں "الفوز الکبیر" اسی طرح ممد و معاون ہو سکتی ہے جیسے کہ آج سے ڈھائی سو سال قبل تھی۔ اسے سوائے قرآن کریم کے اعجاز اور حضرت شاہ صاحبؒ کی کرامت کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ علوم قرآنی (پنجگانہ) کی بحث، ناسخ و منسوخ کی بحث، شان نزول اور دیگر آسمانی کتب کی تحریف کے متعلق بحثیں وغیرہ وغیرہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی نظیر متقدمین و متاخرین کسی کی تصنیف میں نہیں ملتی۔

اگر حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ قرآن اور "الفوز الکبیر" کا بہ امعان نظر مطالعہ کر لیا جائے تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ معمولی عقل کے آدمی کو بھی حسب ضرورت فہم قرآن حاصل ہو سکتا ہے، اور کچھ ہو یا نہ ہو، اس کی روح قرآن کریم کی رُوح سے آشنا تو ہو ہی جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے ترجمہ کے شائع ہوتے ہی ان ملاؤں اور تنگ نظر مولویوں کی جماعت میں ہیجان بپا ہو گیا جو قرآن کریم کو عوام کی نظر سے

چھپا کر اپنا اُلو سیدھا کرنا اور لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا چاہتے تھے۔ ان ملاؤں نے قرآن کی وہی حیثیت بنا دی تھی جو ہندو برہمنوں نے وید کی بنا رکھی تھی تاکہ وہ آسانی سے ارباب من دون اللہ بنے بیٹھے رہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے ترجمہ نے ان کے طلسم کو توڑ دیا اور لوگوں کو قرآن کریم سمجھ کر پڑھنے کا موقع ملا۔ چنانچہ ان قدامت پرست، کور نظر اور تنگ ظرف ملاؤں نے حضرت شاہ صاحبؒ کو قتل کرانے کے لیے ان پر حملہ بھی کرایا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ صاحب کو بال بال بچا لیا۔

۲۔ حدیث کی خدمت

مسلمان بادشاہوں کے دورِ حکومت میں جب کہ قاضی و مفتی ہونا ہی علما کے لیے باعث افتخار تھا۔ فقہ، اصول فقہ، صرف و نحو اور منطق و فلسفہ کو چھوڑ کر بھلا علم حدیث و تفسیر کی طرف کون توجہ کرتا۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے علم حدیث کی ترویج و اشاعت کی اپنے طور پر کوششیں کی تھیں، لیکن ایسے وقت میں جب کہ دنیوی مفادات کا بھوت لوگوں کے سر پر سوار ہو، انفرادی کوششیں کہاں بارآور ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی آواز ظاہر پرست اور دنیا طلب علما کے غوغائے ہنگام میں دب کر رہ گئی تھی۔ سب سے پہلے باقاعدہ اور منظم طور پر علم حدیث و تفسیر کی اشاعت کا نظم "مدرسہ رحیمیہ" دہلی سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی رہنمائی میں کیا گیا۔ دنیا کے گوشے گوشے سے طالبان علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آتے۔ مدرسہ رحیمیہ کی آغوش محبت ان کے لیے وا ہوتی۔ طلبا کی آسائش کا نظم تھا۔ علم نبوت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ خالص اور ٹھیٹھ اسلامی ماحول میں ان کی تربیت کی جاتی۔ ان کے کردار کی تعمیر ہوتی اور پھر وہ علم دین کی امانت اپنے سینوں میں سمیٹے اپنے وطن لوٹتے اور اپنی زندگی کو علم دین کی ترویج و تبلیغ کے لیے وقف کر دیتے تھے۔ یہ کوئی شخصی اور انفرادی کوشش نہیں تھی جسے مادہ پرست لوگ دبا دیتے۔ بلکہ ایک نظام قائم کیا گیا تھا۔ ایک تحریک چلائی گئی تھی امت مسلمہ کی قیادت کی صلاحیت رکھنے والی جماعت کھڑی کی جا رہی تھی جسے مرورِ ایام اور انقلاب زمانہ مٹا نہیں سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے جس نظام تعلیم کی تشکیل فرما دی وہ آج تک بہت معمولی سی تبدیلیوں کے ساتھ باقی ہے۔ برِصغیر پاک و ہند

کے لاتعداد مدارس دینیہ میں دی جانے والی تعلیم اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے احادیث کے مجموعوں پر مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ نظر ڈالی اور آپ نے موطا امام مالک کو صحیح بخاری شریف کے مقابلے میں زیادہ مفید اور اہم قرار دیا۔ آپ کا خیال تھا کہ سند کے اعتبار سے موطا کی سند کا سلسلہ سلسلۃ الذہب ہے یعنی راوی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کم سے کم واسطے ہیں۔ یہ خصوصیت صحیح بخاری شریف کو حاصل نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ موطا امام مالکؒ کے اکثر رواۃ مدینۃ منورہ کے ہیں جنھیں عامۃ المسلمین معتمد علیہ مانتے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ حضرت امام مالکؒ سے امام شافعیؒ اور امام محمدؒ (شاگرد و شارح امام ابوحنیفہ) دونوں نے پڑھا ہے اور موطا پر دونوں کی تنقید بھی موجود ہے۔ اس سے موطا کی تصحیح میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے موطا کے علاوہ صحیح بخاری شریف، مسلم شریف، ابو داؤد شریف اور ترمذی شریف کو موطا کی شرح قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ بے شک امام مالکؒ کے استنباط کے بارے میں تو لوگوں میں اختلاف ہے بعض ان کے استنباطات کو تسلیم کرتے ہیں۔ بعض ان کا سرے سے انکار کرتے ہیں۔ بعض ان میں ضعف ثابت کرتے ہیں اور بعض ان کی تصحیح کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک نفس موطا کا تعلق ہے اس کی ترتیب و تہذیب میں امام مالکؒ نے جو کوشش اور جد و جہد کی ہے اس بنا پر تمام مذاہب فقہ کے لیے موطا کو مانے بغیر چارہ نہیں ہے۔ (المسوّٰی ص۹ بحوالہ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ مولانا سندھی ص۱۲۷، ص۱۲۸)۔

موطا کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر حضرت شاہ صاحبؒ نے موطا کی دو شرحیں لکھیں ایک المسوّٰی (عربی میں) دوسری المصفّٰی (فارسی میں)

موطا کو ایک اور خصوصیت حاصل ہے جس کی بنا پر حضرت شاہ صاحب اسے اولیت دیتے ہیں، وہ یہ کہ اگر موطا کی اہمیت کا سارے مسالک فقہ کے متبعین اعتراف کر لیں تو مسالک کے درمیان مابہ الاشتراک امور زیادہ اجاگر ہو جائیں گے۔ امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام محمدؒ تینوں ائمہ موطا کی اہمیت کے معترف ہیں۔ اس طرح فقہی مذاہب کے اختلافات خود بخود مرتفع ہو جائیں گے اور حضرت شاہ صاحبؒ کی یہ آرزو بھی تھی۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے موطا کی ایک اور خصوصیت بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "الغرض میں اس کا قائل ہونے لگ گیا کہ امام مالک کی موطا میں وہ تمام مشکل حدیثیں نہیں پائی جاتیں جن کا سمجھانا اس زمانہ میں بہت مشکل ہے"۔ مولانا موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں "میرے نزدیک قرآن اور اس کے بعد المسوّٰی اسلام کی تعلیم کا ایک مکمل نصاب ہے میں یہ اسلام ساری دنیا کو سکھا سکتا ہوں، مسلمانوں کو ان کے ائمہ فقہ کے طریقے پر اور غیر مسلموں کو عام حکمت کے اصولوں پر۔ چنانچہ تعلیم اسلام کے سلسلے میں جہاں تک مجھے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے، میں اس میں خدا کے فضل سے کامیاب رہا ہوں اور خود اپنے اس تجربے کے بعد میں شاہ ولی اللہ کے اس تجدیدی کارنامہ کی عظمت کو سمجھ سکا ہوں میں نے آزما کے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ موطا کو اصح الکتب ماننے کی کیا قدر و قیمت ہے" (شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ مولانا عبید اللہ سندھی ص۱۴۳-۱۴۴)

علم حدیث کی خدمت کے سلسلے میں حضرت شاہ صاحب کا یہ کارنامہ بھی ناقابل فراموش ہے کہ آپ نے اسناد کے معیار پر پرکھ کر کتب حدیث کی درجہ بندی فرمائی مثلاً آپ نے اوّل درجہ پر موطا، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو رکھا۔ اس لیے کہ ناقدین حدیث نے ان کتابوں کی اسناد کو بالاتفاق رائے صحیح قرار دیا ہے اور انھیں فقہا نے سند کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے دوسرے درجے پر جامع ترمذی، سنن ابو داؤد اور سنن نسائی کو رکھا ہے۔ صحت کے اعتبار سے یہ کتب درجہ اول کی کتب سے بہت قریب ہیں۔ آپؒ نے درجہ سوم پر حدیث کی ان کتابوں کو رکھا ہے، جن کی مرویات کو علمائے سلف نے روایت تو کیا ہے، لیکن ان کی صحت کا کوئی التزام نہیں رکھا ہے۔ مثلاً مصنف عبد الرزاق، مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ، بیہقی، طبرانی وغیرہ۔ درجہ چہارم میں آپ نے ان احادیث کو رکھا ہے جن کا اتا پتا متقدمین کے یہاں نہیں ملتا، لیکن متاخرین نے ان کو روایت کیا ہے۔ مثلاً کامل ابن عدی، مسند الخوارزمی وغیرہ۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی اس درجہ بندی کی وجہ سے حدیث کے قالب میں ایک تازہ روح پیدا ہو گئی۔ محققین و غیر محققین کے مابین ایک خط امتیاز کھنچ گیا اور غیر محققانہ طرز مطالعہ کا یکسر سدباب ہو گیا۔

علم حدیث کی خدمات جلیلہ کے سلسلہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ کارنامہ بھی کم اہم نہیں ہے کہ آپ نے احادیث کی حکمتیں بھی بیان فرما دی ہیں۔ جو شخص حجۃ اللہ البالغہ کا مطالعہ کرے گا اسے حضرت شاہ صاحبؒ کی اس خدمت کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

آپ کا دوسرا اہم کام باہم مختلف احادیث کے مابین فنکارانہ مہارت سے تطبیق دینا ہے۔ اکثر احادیث کے درمیان بادی النظر میں تناقض نظر آتا ہے۔ لیکن حضرت شاہ صاحب کی تطبیق کے بعد وہ تعارض یا تناقض مرتفع ہوجاتا ہے۔ ازالۃ الخفاء وغیرہ میں اس کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔

علم حدیث کی ان ہی جلیل القدر خدمات کی بدولت علامہ رشید رضا مصری کو "مفتاح کنوز السنۃ" کے مقدمہ میں علمائے ہند کی علمی خدمات کا اعتراف کرنا پڑا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

ولولا عنایۃ اخواننا علماء الھند بعلوم الحدیث فی ھذا العصر لقضی علیھا بالزوال من امصار الشرق فقد ضعفت فی مصر والشام والعراق والحجاز منذ القرن العاشر للھجرۃ حتی بلغت منتھی الضعف فی اوائل ھذا القرن الرابع عشر۔

(ترجمہ) اگر ہمارے بھائی علمائے ہند اس زمانہ میں علوم حدیث کی طرف توجہ نہ فرمائے ہوتے تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہوچکا ہوتا۔ کیونکہ مصر، شام، عراق اور حجاز میں دسویں صدی ہجری سے یہ علم ضعف کا شکار ہوچکا تھا اور چودھویں صدی ہجری کے اوائل تک تو یہ ضعف اپنی آخری منزل پر پہنچ گیا تھا۔

علامہ رشید رضا کے اس قول میں علمائے ہند سے مراد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کا لائق صد احترام خانوادہ ہے جس نے علوم حدیث کے احیا، ترویج و اشاعت اور تدریس و تبلیغ کے سلسلے میں بے مثال خدمات انجام دیں۔

علامہ عبدالحیؒ نے نزہۃ الخواطر میں حضرت شاہ صاحب کے بارے میں مفتی عنایت احمد کاکوروی کا یہ قول بالکل بجا طور پر نقل کیا ہے کہ

"شاہ ولیؒ اللہ طوبیٰ کے ایک درخت تھے جس کی جڑیں ان کے گھر میں اور شاخیں امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوات والتحیات کے ہر فرد کے گھر میں تھیں۔"

۳۔ علم فقہ کی خدمت

دینی علوم میں قرآن و حدیث کے بعد فقہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارکہ میں مدوّن شکل میں یہ علم موجود نہیں تھا اس لیے کہ مہبط وحی بذاتِ خود موجود تھے اور مسلمانوں کو جن مسائل میں رہبری کی ضرورت ہوتی انھیں فوراً میسر ہو جاتی تھی۔ آپ کی وفات کے بعد صحابہ کرام کا دور آیا جسے خیر القرون ہی میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس دور میں بھی مدوّن شکل میں فقہ کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس لیے کہ صحابہ کرامؓ شریعت کے اسرار و رموز سے واقف اور آغوش نبوت کے تربیت یافتہ تھے۔ زندگی کے نشیب و فراز میں جو الجھنیں پیش آتیں یا عبادات کی ادائیگی میں جو مسائل سامنے آتے صحابہ کرامؓ قرآن کریم اور صحبت نبویؐ کے فیضان سے اسے بہ آسانی حل کر لیتے۔ اس کے علاوہ صحابہ کرام کی جماعت میں بہت سے ایسے بھی صحابی تھے جو فقیہ مانے جاتے اور کسی مسئلہ میں الجھن پیش آتی تو ان سے دریافت کرکے اس الجھن کو دور کر لیا جاتا تھا۔ لیکن صحابہؓ کے بعد تابعین و تبع تابعین کا دور آیا تو بُعد عہد اور اسلامی مملکت کی وسعت کے باعث اجتہاد کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ تمام مراکز حکومت میں دوسری صدی ہجری کے آغاز ہی سے مجتہدین نظر آنے لگے۔ پھر بھی ایک معین مجتہد کے مذہب کو اختیار کرنے یا مخصوص شخص کے مذہب پر فتویٰ صادر کرنے یا کسی خاص شخص کے مسلک پر اعتماد کرنے کا رجحان عام نہیں ہوا۔ لیکن اسی صدی کے اختتام پر یہ نظریہ عام ہو گیا اور لوگ کسی خاص مجتہد سے وابستہ ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ مجتہدین کی آرا کا اختلاف بھی ابھر کر سامنے آنے لگا۔ یہاں تک کہ چوتھی صدی کے بعد فقہی معاملات میں بہت زیادہ اختلاف پیدا ہو گیا، اور کسی خاص امام کی تقلید لوگوں کے درمیان زور پکڑ گئی۔ جوں جوں دن گزرتے گئے، اختلافات، مناظروں اور مجادلوں کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ تاآنکہ تقلید نے "تقلید جامد" کی حیثیت اختیار کر لی اور فقہی مذاہب میں غلو کی صورت پیدا ہو گئی۔ چوتھی صدی کے آغاز ہی سے مجتہد مستقل تو ناپید ہو گئے اب صرف "مجتہد منتسب" رہ گئے۔ تفریعات و تخریجات کا ہنگامہ گرم ہو گیا اور جزوی و فروعی اختلافات نے اصولی اختلاف کا روپ دھار لیا۔ چونکہ اختلافات علما کی سطح سے اتر کر عوام کی سطح

پر آگئے تھے، اس لیے تشدد، تصلب اور تقشف نے راہ پائی۔ ظاہر ہے کہ یہ شکل امت کے مفاد کو نقصان پہنچانے والی تھی اور ان حالات پر ہر وہ شخص کڑھتا تھا جو ملت اسلامیہ کا بہی خواہ اور اس کی ترقی و کامرانی کا متمنی تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اپنی کتاب الانصاف فی بیان سبب الاختلاف میں امام غزالیؒ کے الفاظ میں اس دور کا نقشہ یوں پیش کرتے ہیں۔

"جب ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کا عہد ختم ہو گیا تو خلافت ایسے لوگوں کو ملی جو بغیر استحقاق کے اس کے مالک ہوئے۔ وہ علم فتویٰ و احکام کو اچھی طرح نہیں جانتے تھے چنانچہ وہ فقہا سے مدد لینے اور اپنے تمام احوال میں ان کو ساتھ رکھنے پر مجبور ہوئے۔ اس وقت تک ایسے علما موجود تھے جو قدیم طرز پر برابر ثابت قدم اور دین خالص پر قائم تھے۔ جب انھیں (خلفا کی طرف سے) بلایا جاتا تو وہ دور بھاگتے، اور ان سے اعراض کرتے۔ ان زمانوں کے لوگوں نے علما کی یہ عزت دیکھی اور باوجود حکام سے ان کے اعراض کے حکام کے ان کی طرف متوجہ ہونے کو ملاحظہ کیا۔ یہ دیکھ کر لوگ حصول عزت اور طلب جاہ کی خاطر علم حاصل کرنے کی طرف جھک پڑے۔ چنانچہ پہلے جہاں فقہا مطلوب تھے اب وہ خود طالب بن گئے۔ پہلے جہاں وہ سلاطین سے اعراض کرنے کی وجہ سے معزز تھے اب وہ ان کے دروازوں پر جانے کی وجہ سے ذلیل ہو گئے۔ بے شک ان میں کچھ مستثنیات بھی تھے جن کو توفیق الٰہی شامل حال تھی۔"

آگے چل کر حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں "اسی طرح اس بحث و جدل نے ایسی جہالت اور اس طرح کے خلط ملط شکوک و اوہام کو جنم دیا جن کی کوئی حد نہ تھی۔ .... اس وقت فقیہ وہی تھا جو بہت بولتا اور جو اس کے منہ میں آتا کہہ دیتا۔ جسے فقہا کے قوی اور ضعیف اقوال بلا ان میں تفریق کیے یاد ہوتے اور وہ انھیں باچھیں کھول کھول کر بیان کرتا اور محدث وہ تھا جو صحیح اور غیر صحیح و سقیم احادیث کو شمار کرتا اور اپنے جبڑوں کے زور سے انھیں کہانیوں کی طرح فر فر سناتا جاتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ ایک کلی و عمومی بات ہے۔ کیونکہ اللہ کے بندوں میں سے ایسا گروہ بھی ہے کہ اس کے مخالف اسے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔

(ارمغان شاہ ولی اللہ ص۱۷۴ - ص۱۷۵)

ان حالات میں حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ صورت تجویز فرمائی کہ جامد تقلید سے احتراز برتا جائے اور اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا جائے۔ گو کہ یہ اجتہاد "اجتہاد مستقل" نہ ہو بلکہ کسی ایک امام کی تقلید اختیار کرتے ہوئے عصری تقاضوں کے پیش نظر کیا جائے۔

المسوّی میں فرماتے ہیں۔ تفصیل ایں مجمل آنست کہ اجتہاد در ہر عصر فرض بالکفایہ است۔ مذکورہ بالا گفتگو سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ حضرت شاہ صاحبؒ تقلید کے خلاف ہیں کیونکہ فیوض الحرمین کے مشہد ۳۳ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس بات کی وصیت کی گئی ہے کہ مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب کی تقلید کروں۔ حالانکہ میری فطرت اس سے ابا کرتی تھی۔

اس کے علاوہ العقد الجید میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ:

"چار مذاہب کی پیروی میں مصلحت عظیمہ مضمر ہے۔"

حضرت شاہ صاحبؒ کی یہ دلی آرزو تھی کہ چاروں فقہی مسالک کے مابین پائے جانے والے تنازعات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں اور آپ نے اس ضمن میں عملی تطبیق کے ذریعہ گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس سلسلے میں آپؒ کا مشورہ یہ ہے کہ:

"چونکہ شافعی اور حنفی مذاہب کو قبول عام حاصل ہے ان کی تصانیف بھی بے شمار ہیں اور ان کے ماننے والوں کی تعداد بھی معتدبہ ہے اس لیے جو بات اس وقت ملأ اعلیٰ کے علوم سے موافقت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں مذہبوں کو ملا کر ایک کر دیا جائے۔ ان کی ان تمام باتوں کو قائم رکھا جائے جو ان میں اور حدیث کی دیگر کتب میں مشترک ہیں اور ان تمام باتوں کو رد کر دیا جائے جن کی کوئی اصل سرے سے فراہم ہی نہ ہو سکے۔ (التفہیمات الالٰہیہ بحوالہ شاہ ولی اللہ کی تعلیم از جلبانی ص۸۱-۸۲)

چونکہ ہندوستان میں حنفی مذہب کو بے حد فروغ حاصل ہوا اور یہاں کے مسلمانوں کے دل میں حنفی مذہب جاگزیں تھا اس لیے حضرت شاہ صاحبؒ کو بذریعہ الہام یہ اطلاع

دی گئی کہ وہ فروعات (فقہی مسلک) میں اپنی قوم کی مخالفت نہ کریں۔ فیوض الحرمین مشہد ۳۳ کی عبارت یہ ہے: وایاک ان تخالف القوم فی الفروع فانہٗ مناقضۃ لمراد الحق (اور خبردار اپنی قوم کی فروعات میں مخالفت نہ کرنا کیونکہ یہ امر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہوگا۔)

ہر اس شخص کے لیے جو شاہ ولی اللہ کی فقہی خدمات کا جائزہ لینا چاہے یہ ضروری ہے کہ وہ حضرت شاہ صاحبؒ کی اس حیثیت کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہ کرے، کہ حضرت شاہؒ صاحب حنفیت اور شافعیت کے لیے "مجمع البحرین" تھے۔

آپ کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ جن کے فیضان تربیت و تعلیم نے حضرت شاہ صاحبؒ کے افکار کی بنیادوں کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا، کٹر حنفی تھے۔ سفرِ حج کے دوران جب آپ مدینہ منورہ میں اقامت پذیر تھے اور مشائخ مدینہ سے استفادہ کر رہے تھے تو آپ سب سے زیادہ شیخ ابوطاہر مدنیؒ کے افکار و نظریات سے متاثر ہوئے۔ شیخ ابوطاہر مدنیؒ شافعی مذہب کے پیرو تھے۔ حضرت شاہ صاحب کی شخصیت میں اس "مرج البحرین" نے ایک لطیف قسم کی رنگا رنگی اور جامعیت پیدا کر دی اور انجام کار آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان دونوں مذاہب میں بنیادی اختلافات نہیں ہیں، اسی وجہ سے اگرچہ حضرت شاہ صاحبؒ عملاً حنفی تھے، لیکن آپ نے کبھی بھی شافعی مذہب کی توہین برداشت نہیں کی بلکہ دونوں مذاہب کا یکساں طور پر احترام کرتے تھے۔ نیز اپنے مسلک کی تشریح میں ایک مرتبہ خود کو "الشافعی درساً" بھی کہا۔

شاہ صاحبؒ کے اس طرزِ فکر نے دبستان ولی اللّٰہی کے دانشگان سے کافی حد تک تصلب اور تعصب کو دور کر دیا۔ درحقیقت یہ حضرت شاہ صاحب کا عظیم کارنامہ ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے، حضرت شاہ صاحب کے فلسفہ کا بنیادی عنصر "الجمع بین المختلفات" ہے۔ فقہ کے اختلافی مسائل پر نگاہ ڈالتے وقت حضرت شاہؒ صاحب اپنے اس "جمع و تطبیق" کے عمل کو بار بار استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً رفع یدین، قرأۃ خلف الامام، آمین بالجہر، مسح راس، مسئلہ ھدیٰ ابل سائمہ کی زکوٰۃ کا مسئلہ۔ حدیث مصراۃ وغیرہ میں حضرت شاہؒ صاحب نے تطبیق کر کے ایک قابل تقلید نمونہ چھوڑا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہٹ دھرمی اور بے جا ضد سے حرفِ نظر کر کے غور و فکر کیا جائے اور ان تشریحات کو مشعلِ راہ بنایا جائے جنھیں اختلافی مسائل میں عمل تطبیق انجام دیتے وقت حضرت شاہؒ صاحب برتتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ باہمی مخالفت کا امکان کم سے کم ہو جائے گا، بلکہ مستقبل کے لیے ایک مستحکم لائحہ عمل مرتب ہو سکتا ہے۔ اس طرح حضرت شاہؒ صاحب کی مختلف مذاہب فقہیہ کو ایک کرنے کی آرزو بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے۔

تصوّف کی خدمت

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا گھر ہی تصوف کا گہوارہ تھا۔ آپؒ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ اپنے دور کے مانے ہوئے صوفی تھے۔ شاہؒ صاحب نے ان ہی کی صحبت میں تصوف کے منازل طے کیے اور ان ہی سے اشغال سیکھے۔

"پانزدہم سال بود کہ با والد بزرگوار بیعت کردم و بہ اشغال صوفیہ خصوصاً نقشبندیہ مشائخ مشغول شدم و از حیثیت توجہ و تلقین و تعلیم آداب طریقت و لبس خرقہ صوفیا ارتباط درست نمودم" (الجزء اللطیف) میں ابھی پندرہ سال کا تھا کہ میں نے اپنے والد بزرگوار کی بیعت کی اور صوفیہ کے اشغال خصوصاً نقشبندی مشائخ کے اشغال میں مشغول ہو گیا اور ان سے توجہ، تلقین، آداب طریقت اور خرقہ صوفیا حاصل کر کے اپنے روحانی سلسلے کو درست کر لیا۔

۱۱۴۳ھ میں جب آپ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے تشریف لے گئے تو وہاں حضرت شیخ ابوطاہر مدنیؒ کی صحبت میں آپ نے بے پایاں فوائد و معارف حاصل کیے اور حضرت شیخؒ موصوف نے آپ کو تمام سلاسل طیبہ کا خرقہ جامعہ عطا فرمایا۔ اب آپ تصوف کے تمام اسرار و رموز سے آگاہ اور اس کے مختلف شعوب کے ظاہری و باطنی نشیب و فراز سے واقف ہو چکے تھے اس لیے آپ جاہل صوفیہ اور کرامت فروش پیروں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ آپ کے دور میں تصوف کا چشمہ صافی گدلا ہو چکا تھا۔ لوگ حقیقتوں سے دور چند شعبدوں اور رسومات ہی کو طریقت سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ حضرت شاہؒ صاحب اپنے وصیت نامہ میں فرماتے ہیں:

"دست در دست مشائخ ایں زمان کہ بانواع بدعت مبتلا ہستند ہرگز نباید داد و بیعت ایشاں نباید کرد و بہ کرامات ایشاں معزز نباید بود...... کرامات فروشان ایں زمان ہمہ الا ماشاء اللہ طلسمات و نیرنجات را کرامات دانستہ اند"۔

اس زمانہ کے مشائخ کے ہاتھ میں جو قسم قسم کی بدعتوں میں مبتلا ہیں اپنا ہاتھ ہرگز نہیں دینا چاہیے اور ان کی بیعت نہیں کرنی چاہیے اور نہ ان کی کرامات سے دھوکہ کھانا چاہیے۔

اس زمانہ کے کرامات فروش باستثنائے چند طلسمات اور نیرنجات ہی کو کرامت سمجھ بیٹھے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ ایسے صوفیوں کو دین کے چور اور ڈاکوؤں سے تشبیہ دیتے ہیں۔

"اما الجهال والمجاهدون للتصوف فاولئك قطاع الطريق ولصوص الدين"۔ (التفہیمات الالٰہیۃ جلد ۲)

(ایسے جاہل صوفی اور مدعیان تصوف (جنھیں قرآن کریم اور حدیث نبوی سے کوئی علاقہ نہیں) دین کے چور اور ڈاکو ہیں۔

ہاں! حضرت شاہ صاحب ان صوفیائے کرامؒ کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جن کے احوال و مقامات کی اساس قرآن و سنت ہے اور جو ایک قدم بھی جادۂ شریعت سے ہٹنا پسند نہیں کرتے بلکہ آپ ایسے لوگوں سے برات ظاہر کرتے ہیں جو ایسے حقانی و ربانی علماء و صوفیا کی صحبت سے بھاگتے ہیں۔

"ليس منا من ترك ملازمة العلماء اعني الصوفية الذين لهم حظ من الكتاب والسنة" (حوالا بالا)

یعنی وہ شخص میری جماعت سے الگ ہے جو علماء کی صحبت کو ترک کر دے۔ یعنی ان صوفیہ کی صحبت سے دُور ہو جائے جنھیں کتاب و سنت کے علوم سے بہرۂ وافر ملا ہے"۔

شاہ صاحبؒ کے دَور میں ایک دوسری مصیبت بھی اپنے شباب پر تھی اور وہ ہے شریعت و طریقت کے درمیان مغائرت کا تصور۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ شریعت ایک الگ چیز ہے اور طریقت الگ۔ شریعت کے نمائندے علما اور فقہا

تھے اور طریقت کے علمبردار حضرات صوفیہ۔ اس ثنویت کی وجہ سے دین میں شدید اختلال پیدا ہو گیا تھا اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش کردہ جامع نظام حیات سخت قسم کے بحران کا شکار تھا۔ اس ثنویت کی وجہ یہ تھی کہ عام صوفیہ انسان کے بدن میں ظاہری اور باطنی قوتوں کو الگ الگ مانتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اسلام کی تعلیمات کے بھی دو حصے کیے۔ ایک وہ حصہ جو انسان کے ظاہر کی اصلاح کرتا ہے اور دوسرا وہ جو اس کے باطن کو سنوارتا ہے۔ اوّل الذکر کا نام انھوں نے شریعت اور ثانی الذکر کا طریقت رکھ لیا تھا۔

عام صوفیہ کے نزدیک انسان کے بدن میں دماغ، قلب اور جگر اعضائے رئیسہ ہیں۔ ارباب تصوف ان اعضائے رئیسہ کی ظاہری قوتوں کے علاوہ ان کی باطنی قوتیں بھی مانتے ہیں اور وہ ان کے نزدیک لطیفۂ عقل، لطیفۂ قلب اور لطیفۂ نفس تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مذکورہ بالا لطائف کے انجلا سے احوال و مقامات پیدا ہوتے ہیں۔ اس تصور نے ظاہر و باطن کے مابین مغائرت اور دوئی کو جنم دیا جو آگے چل کر شریعت و طریقت کے درمیان مغائرت پر منتج ہوئی۔ اس مشکل کو حضرت شاہ صاحبؒ نے اس طرح حل فرمایا کہ آپ نے مذکورہ بالا لطائف ثلاثہ کے علاوہ ایک "لطیفۂ جوارح" بھی تجویز فرمایا۔ چنانچہ اپنی کتاب الطاف القدس میں حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"اس لطیفہ کو سمجھانے کے لیے مجھے ایک اُونٹ دکھایا گیا جو اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے تینوں لطائف بے حد کمزور ہو چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اونٹوں کی لمبی قطار میں چل رہا تھا۔ بجز چلنے کے اس میں کوئی طاقت نہیں تھی۔ وہ دم نکلنے تک چلتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ اس کی رُوح نکل گئی اور وہ چلتے چلتے یک لخت گر کر مر گیا۔ یہ اُونٹ جس وقت مرتا ہے عین اسی وقت وہ چلنے سے رُک جاتا ہے۔ اس کی موت اور اس کا چلنے سے رُکنا دونوں فعل ایک وقت ہی ہوتے ہیں۔ بعد ازاں مجھے بتایا گیا کہ یہ اُونٹ لطیفۂ جوارح کے مقام فنا میں تھا۔ یعنی اسی طرح شریعت کی جانب سے اعمال کا احتساب اور گرفت بھی اسی لطیفے پر منحصر ہے"۔

اس مثال کے بعد لطیفۂ جوارح کی حقیقت یوں واضح ہوئی کہ انسان کے اعضائے رئیسہ

یعنی دماغ، قلب اور جگر کے دو رخ ہیں۔ ان کا ایک رُخ لطیفہ جوارح کی طرف ہوتا ہے اور اسی لطیفہ جوارح کی اصلاح وتکمیل شریعت کا مقصود ہے اور ان کا دوسرا رخ اپنے باطن کی طرف ہے جو ان کا منبع اصلی ہے اور ان لطائف کی تکمیل تصوف کے ذریعہ ہوتی ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی اپنے مقالہ "شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ" کے ص ۲۰۱ پر لکھتے ہیں۔

"انسان کے مختلف قویٰ کو اگر اس طرح پر ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں سمجھ لی جائیں اور دماغ، دل اور جگر کے ظاہری اعمال سے شروع کر کے ہم لطیفۂ جوارح پر پہنچیں اور پھر اس سے عقل، قلب اور نفس کی باطنی قوتوں پر آئیں اور یہ سب کے سب انسانی قویٰ کے مختلف درجے مان لیے جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ جس طرح یہ قویٰ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ متصل اور وابستہ ہیں اسی طرح شریعت جو جوارح کی اصلاح اور تکمیل کرتی ہے اور طریقت جس کا کام اعلیٰ لطائف کا تزکیہ اور ترقی ہے دونوں الگ الگ چیزیں نہیں رہ جائیں گی بلکہ یہ ایک چیز کے دو رنگ یا ایک درخت کے دو ثمر ہوں گے۔"

الغرض حضرت شاہ صاحب کی تعبیرات کو پیش نظر رکھنے کے بعد اس ثنویت اور دوئی کا خاتمہ ہو گیا۔ جو دین میں اختلال کا باعث تھی۔ حضرت شاہ صاحب کا یہ کارنامہ عظیم القدر کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

صوفیہ کے مابین مسئلہ وجود میں قدیم زمانے سے اختلاف رہا ہے۔ بعض حضرات وحدت الوجود (ہمہ اوست) کے قائل تھے اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ اس نظریہ کے بانی کہے جاتے ہیں۔ لیکن حضرت شاہ صاحب سے تقریباً سو برس قبل حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے وحدت الشہود (ہمہ از اوست) کے تصور کو بالصراحت پیش فرمایا اور ابن عربیؒ کے نظریہ کی نہایت شد و مد سے تردید فرمائی۔ مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۲۶۰ میں فرماتے ہیں۔

"ھو سبحانہٗ وراء الوراء ثم وراء الوراء ثم وراء الوراء"

حضرت شاہ صاحب کے دور میں یہ اختلاف بھی اپنے شباب پر تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ حضرت شاہ صاحب دونوں دھڑوں میں سے کسی ایک دھڑے میں شامل ہو کر

اپنی دکان چمکا لیتے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا بلکہ کافی غور و خوض کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ:

"وقد وقع عندنا ان المکشوفین صحیحان جمیعاً" (المکتوب المدنی)

(میرے نزدیک ان دونوں مکشوفات (کے مابین کوئی معقول فرق نہیں ہے) اور دونوں صحیح ہیں۔

حضرت شاہ صاحب اس نزاع کو نزاع لفظی کہتے ہیں۔ کیونکہ آگے چل کر دونوں مشائخ ایک ہی نقطہ پر جمع ہو جاتے ہیں۔ دونوں مشائخ (شیخ اکبر ابن عربیؒ و شیخ احمد مجدد الفؒ ثانی) کے نظریات میں تطبیق دینے کے لیے حضرت شاہ صاحب نے "نفس کلیہ" کا نظریہ پیش کیا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ زید، بکر، عمرو بظاہر ایک دوسرے کے غیر ہیں کیونکہ زید زید ہے بکر نہیں۔ لیکن ایک اعتبار سے ایک دوسرے کے عین ہیں اس لیے کہ انسانیت ان سب میں مشترک ہے۔ بعینہٖ اسی طرح اس کائنات کا بھی ایک نفس ہے جو ساری کائنات میں مشترک ہے اور اس کائنات کی تمام کثرتیں اسی ایک وحدت (نفس کلیہ) سے صادر ہوتی ہیں۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر ابن عربیؒ کا یہ خیال ہے کہ یہ کائنات عین ذات باری تعالیٰ ہے تو اس سے ان کی مراد نفس کلیہ ہے جو درحقیقت الوجود المنبسط علیٰ ھیاکل الموجودات ہے۔ جو قائم بالذات اور تمام موجودات پر طاری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وجود اس وجود منبسط سے وراء الوراء ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ وجود منبسط (نفس کلیہ) اور ذات الٰہی کے درمیان کونسی نسبت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ

"نسبتی است معلوم المدنیۃ مجھول الکیفیۃ" (الطاف القدس)

یعنی ایسی نسبت جس کی حقیقت تو ضرور معلوم ہے لیکن اس کی کیفیت معلوم نہیں ہے۔

مکتوب مدنی میں حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ

"اس جگہ پر دو اقوال ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ ممکنات کے حقائق وہی اسماء و صفات ہیں جو مرتبہ علم میں متمیز تھے (یعنی ممکنات کے حقائق اس وجود منبسط کے اسماء و صفات ہیں) (یہ ابن عربیؒ کا قول ہے) دوسرا قول (حضرت مجددؒ) یہ ہے کہ ممکنات کے حقائق ان اسماء اور صفات کے عکوس و ظلال ہیں جو عدمات میں منطبع تھے اور ان دونوں تعبیرات کے درمیان اتنا کمزور فرق ہے کہ کسی محقق کو ان کی طرف

توجہ بھی نہیں کرنی چاہیے۔"

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہؒ صاحب کی مذکورہ بالا تصریحات اور آپؒ کے پیش کردہ "نفس کلیہ" کے تصور کو سمجھ لینے کے بعد دونوں نظریات (وحدت الوجود اور وحدت الشہود) کا اختلاف محض نزاع لفظی رہ جاتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اگر حضرت شاہؒ صاحب کی اسی خدمت پر نگاہ ڈالی جائے تو ہر انصاف پسند کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ شاہؒ صاحب نے تصوف کی عظیم ترین خدمت انجام دی ہے۔

حضرت شاہؒ صاحب کے فلسفیانہ نظریات

حضرت شاہؒ صاحب کے فلسفیانہ نظریات کسی ایک کتاب میں مدون نہیں ہیں، بلکہ آپؒ کی مختلف تصنیفات مثلاً حجۃ اللہ البالغہ، سطعات، لمعات اور الطاف القدس وغیرہ میں بکھرے پڑے ہیں۔

ہم ذیل میں مذکورہ بالا کتابوں سے اخذ کردہ نظریات بالاختصار پیش کر رہے ہیں۔

فلسفہ میں سب سے اہم اور پیچیدہ مسئلہ "وجود" کا مسئلہ ہے۔ جب ہم موجودات کے اس لاتناہی سلسلے پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں دو حیثیتیں خاص طور پر محسوس ہوتی ہیں (۱) اشتراک (۲) امتیاز۔

یعنی باوجود اس کے کہ اشیا بعض صفات کے اعتبار سے اشتراک رکھتی ہیں، ایک دوسرے سے امتیاز بھی رکھتی ہیں۔ مثلاً انسانیت میں سارے انسان شریک ہیں۔ لیکن اپنے خد و خال اور قد و قامت نیز طبائع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ممتاز بھی ہیں۔ یہی حال تمام موجودات کا ہے کہ وصف وجود سب میں مشترک ہے۔ لیکن سب ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس کائنات کی اصل وجود ہے۔ دیگر تمام امتیازات اصلی نہیں بلکہ اعتباری ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ کائنات کی اصل وجود ہے، بعض صوفیہ (ابن عربیؒ وغیرہ) نے یہ نتیجہ نکالا کہ خدا خود موجودات سے عبارت ہے۔ ایک دوسرے گروہ نے موجودات کو عکوس قرار دیا (یہ حضرت مجددؒ کا گروہ ہے) تفصیلات گزر چکی

ہیں۔ حضرت شاہؒ صاحب نے اس کا حل "نفس کلیہ" کے نظریہ کے ذریعہ نکالا۔ شاہؒ صاحب کے نزدیک نفس کلیہ جوہر اور عرض دونوں پر مشتمل ہے۔ کیونکہ شاہؒ صاحب فرماتے ہیں، کہ حقیقت فی نفسہٖ ایک ہی ہے۔ جب وہ اپنے وجود کے اصلی لباس میں ظاہر ہوتی ہے تو اس کا نام جوہر ہوتا ہے اور جب وہ دوسرے وجود کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے تو ہم اسے عرض کہتے ہیں۔ شاہؒ صاحب کے نزدیک نفس کلیہ کا صدور ذات حق سے بطریق ابداع ہوا ہے۔ یعنی کسی ایسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا جس کا مادہ پہلے سے موجود نہیں تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ مُبدِع اور مُبدَع کے درمیان کونسی نسبت ہے۔ شاہؒ صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی کیفیت معلوم نہیں ہے اور نہ عقل اس کا ادراک ہی کر سکتی ہے۔ حضرت شاہؒ صاحب ساری کائنات کو "شخص اکبر" کا نام دیتے ہیں اور اس کے اندر جو روح دوڑ رہی ہے ان کے نزدیک نفس کلیہ ہے۔

شخص اکبر ایک عظیم ترین خیالی قوت کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک قوت ارادی بھی ہے۔ شخص اکبر کی قوت ارادی کا مرکز (قلب) نفس کلیہ کا عرش ہے۔ اس عرش پر تجلی اعظم کا عکس پڑتا ہے (اب رہا یہ سوال کہ شخص اکبر کی تخلیق کن مراحل سے گزری تو اس کا جواب سطعات کے سطعہ اوّل، دوم، سوم اور چہارم میں ہے) عرش چونکہ ساری کائنات کو محیط ہے اس لیے تجلی اعظم کا تعلق بواسطہ عرش تمام مخلوقات سے رہتا ہے۔ عرش کے نیچے انسانیت کا ایک مجموعہ موجود ہے جسے امام نوع انسانی یا انسان اکبر کہا جاتا ہے۔ نوع انسانی کا امام نوع سے تعلق ناگزیر ہے۔ اسی طرح عرش کے نیچے ہر نوع کا امام موجود ہے جس سے اس نوع کے افراد کا تعلق ہوتا ہے۔ فرشتوں کی مرکزی جماعت کی سب سے بڑی قوت بھی یہیں موجود ہے۔ وہ جگہ جو فرشتوں کی قوت کا مسکن ہے اسے حظیرۃ القدس کہتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ میں حظیرۃ القدس کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ وہ روحانی دنیا ہے جہاں ملائکہ مقربین اور کاملین کی ارواح کا اجتماع ہوتا ہے۔ اسی کو الرفیق الاعلیٰ اور الندی الاعلیٰ بھی کہتے ہیں۔ اس کائنات کے تمام اہم امور اسی جگہ طے پاتے ہیں۔ اسی سے نورانیت وجود پذیر ہو کر کائنات میں اعمال خیر کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ حظیرۃ القدس کے باسیوں کا قبلہ و کعبہ "تجلی اعظم" ہے۔ انسان

کی ترقی کی معراج یہ ہے کہ وہ اس حظیرۃ القدس کا رکن بن جائے۔ حضرت شاہؒ صاحب عالم مثال کے بھی قائل ہیں۔ آپؒ کا خیال ہے کہ کائنات میں ایک ایسے عالم کا بھی وجود ہے جو اگرچہ غیر مادی ہے۔ لیکن اس میں معانی و افعال مناسب صورتیں اختیار کرتے ہیں اور جو واقعات اس دنیا میں پیش آتے ہیں ان کی تخلیق اس عالم (مثال) میں پہلے ہی ہو جاتی ہے۔

اسے شخص اکبر کے "دماغ" کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

سیاسی نظریات

حضرت شاہؒ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے سیاسی نظریات دیگر افادات کی طرح ایک جگہ مدون شکل میں موجود نہیں ہیں بلکہ ان کی مختلف کتابوں مثلاً حجۃ اللہ البالغہ، البدور البازغہ، التفہیمات الالٰہیہ اور فیوض الحرمین میں ملتے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ ان کے سیاسی افکار و خدمات کا مختصر جائزہ پیش کر دیں (وما توفیقی الا باللہ العزیز الحکیم)

حضرت شاہؒ صاحب قوم اور اجتماع کو بمنزلہ ایک شخص کے مانتے ہیں، خواہ اس کے افراد کی تعداد لاکھوں اور کروڑوں سے متجاوز کیوں نہ ہو، ان کے نزدیک تمام وہ افراد جو ایک نظام تمدن کے ماتحت رہ کر زندگی گزار رہے ہوں یا گزارنا چاہتے ہوں وہ ایک قوم ہیں۔ اب شاہؒ صاحب فرماتے ہیں کہ جس طرح انسان کے جسم میں کبھی کوئی اختلال پیدا ہو کر اسے مریض بنا دیتا ہے اور اس کے علاج کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی طرح قومی نظام میں افراد قوم کی غیر عادلانہ حرکتوں کے باعث خلل پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ارباب حل و عقد کے انتخاب سے مملکت کا کوئی سربراہ مقرر ہو جس میں یہ طاقت ہو کہ لوگوں کو قانون مقررہ کی پابندی پر مجبور کر سکے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچا سکے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں اور کسی قائد کا تقرر عمل میں نہ آئے تو سخت بدامنی اور افراتفری پھیلنے کا امکان ہے۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک حکومت کا فرض ہے کہ وہ مملکت میں امن و امان رکھے، دنگہ فساد، قتل و غارت گری، لوٹ مار، غصب حقوق، تشدد و خیانت اور دیگر قومی و اخلاقی

جرائم کا سدباب کرے۔ لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ کرے۔ مجرموں کو قرار واقعی سزا دے۔ قوم کے ارتقا میں جو عناصر حائل ہو رہے ہوں، ان کا استیصال کرے۔ مثلاً بغاوتوں کو فرو کرے۔ اگر کوئی شخص کسی کی آبرو پر ہاتھ ڈالے یا مرد عورتوں کی وضع اختیار کریں، عورتیں مردانہ عادتوں کی طرف مائل ہونے لگیں، شراب خوری شروع ہو جائے، قمار بازی یا سود خوری یا رشوت کا چلن ہونے لگے، ناپ تول میں کمی کی جانے لگے جسے تطفیف کہتے ہیں یا تجارت اور کسب میں دھوکہ اور فریب کیا جانے لگے، اشیائے ضرورت کا احتکار (ذخیرہ اندوزی) کیا جائے یا خواہ مخواہ اشیا کا دام بڑھانے کے لیے مصنوعی قلت پیدا کی جائے تو حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اجتماع کے مصالح کے تحفظ کی خاطر مذکورہ بالا عناصر کا پوری سختی سے تدارک کرے۔ حکومت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ خصومات کا فیصلہ کرانے کا نظم کرے اور فیصلہ میں پوری تحقیق و احتیاط برتے۔ شہادت لینے اور حلف اٹھوانے میں احتیاط کی جائے۔ سندات اور وثیقوں کا بغور مطالعہ کیا جائے اور قرائن کا اچھی طرح مطالعہ کیا جائے۔ خوب سوچ سمجھ کر ترجیح کی وجوہات تلاش کی جائیں اور اس بات کا خیال رکھا جائے کہ مدعی یا مدعی علیہ کی چالاکی کی وجہ سے کسی کا حق نہ مارا جائے۔ حضرت شاہؒ صاحب فرماتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پیشوں کی تقسیم اجتماع کی ضروریات کے مطابق نہیں ہوتی اس لیے نظام تمدن میں اختلال پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً اجتماع کے اکثر افراد تجارت میں مشغول ہو جائیں اور زراعت پر اس کی اہمیت کے مطابق توجہ نہ کی جائے اس لیے زمینی پیداوار میں جو نوع انسانی کے لیے قوام زندگی ہے ناقابل تدارک کمی آ جائے یا لوگوں کے کسی ایک پیشہ پر ٹوٹ پڑنے کی وجہ سے دیگر پیشے بالکل ہی متروک ہو جائیں اور معاشرے کے مصالح حیات کو پورا کرنے کا کوئی انتظام نہ ہو۔ شاہؒ صاحب فرماتے ہیں کہ پیشوں کے توازن کو قائم رکھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ زراعت کو بمنزلہ اصل خوراک کے سمجھا جائے جس کے بغیر زندگی کا قائم رہنا ناممکن ہے، صنعت و حرفت، تجارت اور حکومت کی ملازمت کو ثانوی حیثیت دی جائے۔ حضرت شاہؒ صاحب کے نزدیک ملک کے کسی بھی علاقہ سے موذی درندہ جانوروں یا موذی و مہلک کیڑے مکوڑوں کا دفع کرنا بھی حکومت کے فرائض میں سے ہے۔ اسی طرح حکومت کا یہ بھی

فرض ہے کہ وہ ایسی تعمیرات کی طرف خصوصی توجہ مبذول کرے جن کا تعلق رفاہِ عام سے ہو مثلاً شہر پناہ کی تعمیر یا لوگوں کے لیے بازاروں کا قیام، مسافروں کے قیام کی سہولتوں کا بند و بست، جہاں پانی کی کمی ہو وہاں کنوئیں کھدوانا، نہروں کے ذریعہ آبپاشی، سرحدوں پر دفاعی استحکامات کا نظم، ملک میں سڑکوں کا جال بچھانا، دریاؤں پر پلوں کی تعمیر، رسل و رسائل کی آسانیاں بہم پہنچانا، تاجروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، صنعت و حرفت کو اس طرح ترقی دی جائے کہ ہر طرح سے اہلِ صنعت و حرفت کی دلداری ہوتی رہے اور ان کو مناسب مراعات دی جائیں۔ زمینداروں کو تاکیدی احکامات دیئے جائیں کہ وہ اپنی زمینوں کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی بنجر اور بغیر کاشت نہ چھوڑیں۔ اسی طرح اہلِ ملک میں تعلیم کو عام کر دیا جائے تاکہ لوگ نوشت و خواند، حساب کتاب، طب، جغرافیہ اور تاریخ میں اچھی طرح ماہر ہوں۔ مزید برآں ملک کے حکمران کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ملک کے حالات سے بخوبی آگاہ رکھے۔ بدمعاش اور نیک چلن اشخاص کا اور ان افراد کا اس کو پورا پورا علم ہو جو کسی خاص فن میں مہارت تامہ کے حامل ہوں یا انھیں امورِ مملکت کی انجام دہی کی خاص قابلیت ہو۔ حکومت کو چاہیے کہ ایسے افراد پر خصوصی نظرِ عنایت رکھے، ان کی تربیت کا انتظام کرے تاکہ ان کے پوشیدہ جوہر ظاہر ہوں اور قوم اور حکومت کو اپنی خداداد صلاحیتوں سے مستفید کر سکیں۔

اختلال تمدن کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ دوسرے پیشوں کو چھوڑ کر حکومت کے دامن سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور ان کی معاش کا تمام تر بوجھ حکومت کے بیت المال پر پڑنے لگتا ہے۔ بعض ان میں سے اپنے آپ کو اہلِ علم ہونے کی حیثیت سے اس کا مستحق سمجھتے ہیں کہ حکومت ان کے رزق کی کفیل ہو۔

بعض ایسے ہیں جن کو اپنے انعام و اکرام سے نوازنا اور بخشیش دینا ملوک کی عادت ہے مثلاً زاویہ نشین فقرا اور درباری شعرا ...... ایسے لوگوں سے جس قدر جلد ملک و قوم کو نجات ہو اتنا ہی ملک و قوم کے لیے مفید ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک اختلال تمدن کا دوسرا سبب یہ ہے کہ زمینداروں کاشت کاروں، اہلِ صنعت و حرفت اور تجار پر حکومت بھاری ٹیکس عاید کر دے جس

کے نتیجہ میں وفادار رعیت ان ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبتی چلی جاتی ہے اور اس کی حالت زبوں سے زبوں تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں "کہ یہ زریں اصول بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آج کا کام کل پر نہ چھوڑ یعنی اگر کوئی شخص ملک کا دشمن ہے اور اس کے نظام میں خلل پیدا کرنا چاہتا ہے تو حکمران یا حکومت کو چاہیے کہ اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لے جب تک اس کا تختہ الٹ کر نہ رکھ دے۔"

اعیان حکومت کے تقرر پر گفتگو فرماتے ہوئے شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ کسی شخص کو حکومت کی کوئی خدمت سپرد کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ دیانت دار ہو۔ فرض کی بجا آوری کا اس کو پورا احساس ہو اور جو کام اسے سپرد کیا جا رہا ہے اس کو بطریقِ احسن انجام دینے کی اس میں بھرپور صلاحیت ہو۔ حکومت کا وہ دل سے خیر خواہ ہو۔ اس کی طبیعت میں تمرد اور سرکشی نہ ہو۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص میں مذکورہ بالا صلاحیتیں نہ پائی جائیں تو اسے ہرگز حکومت کی کوئی خدمت سپرد نہ کی جائے اور اگر ابتدا میں کسی شخص کے اندر بہتر خصوصیات پائی جائیں لیکن بعد میں عدم قابلیت ظاہر ہو تو اس کو برطرف کرنے میں بالکل تاخیر نہ کی جائے۔ کسی ایسے شخص کو بھی عہدہ دینا نامناسب ہے جو حکمران کے ساتھ رشتہ یا قرابت رکھنے پر نازاں ہو۔ حکمران کو چاہیے کہ وہ حکومت کے خیر خواہوں میں تمیز کرے کیونکہ بہت سے لوگ محض ذاتی مفادات یا کسی خوف کی وجہ سے وفاداری کا اظہار کرتے ہیں۔ اگر ان کا مفاد پورا ہو جائے یا خوف رفع ہو جائے تو انھیں مخالفین حکومت کی جماعت میں شامل ہونے میں دیر نہیں لگتی۔

حکمران کو چاہیے کہ ٹیکس لگانے میں کافی حزم و احتیاط برتے۔ ٹیکس صرف اہلِ ثروت پر لگائے جائیں یا ان لوگوں پر جن کے پاس اموال نامیہ ہوں، مثلاً مال مویشی، افزائش نسل اور تجارت کے لیے پالتے ہوں۔ اسی طرح اموال تجارت یا ان زمینوں پر ٹیکس لگائے جائیں جن پر فصل کاشت کی جاتی ہو۔ اگر اموال نامیہ پر لگایا جانے والا ٹیکس بیت المال کی ضروریات کے لیے مکتفی نہ ہو تو پھر اہلِ صنعت و حرفت پر بھی ٹیکس لگائے جا سکتے ہیں۔ ٹیکس لگانے میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ٹیکس کا

بوجھ کم سے کم ہو۔

(ماخوذ از حجۃ اللہ البالغہ مبحث سوم۔ ابواب ۶، ۷، ۸)

حجۃ اللہ البالغہ کی مذکورہ تصریحات کو سامنے رکھیے اور اپنے دور کے حالات پر نگاہ ڈالیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ابواب کا مصنف اٹھارھویں صدی میں نہیں بلکہ بیسویں صدی کے اواخر کے مسائل پر گفتگو کرکے ان کا حل تجویز کر رہا ہے۔ اس نظر کو سوائے مومنانہ فراست کے اور کونسا نام دیا جا سکتا ہے؟

بعض حضرات نے لاطائل تاویلات کے ذریعہ کھینچ تان کر کے حضرت شاہؒ صاحب کی تحریروں سے مغربی جمہوریت (WESTREN DEMOCRACY) مستنبط کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں حضرت شاہؒ صاحب کے ساتھ یہ زیادتی ہے۔ اس لیے کہ شاہؒ صاحب نے اپنے تمام تحریکی نظریات میں قرآن کریم کو مشعلِ راہ بنایا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ قرآن کے مجملات کی وضاحت کے لیے آپ نے احادیث کی طرف رُخ کیا اور پھر ائمہ کرامؒ کے اقوال اور اجماع امت سے مدد لی بھلا ایسے شخص کی تصانیف سے مغربی جمہوریت جیسے لچر اور پوچ نظریہ کا استنباط کیسے کیا جا سکتا ہے۔ مغربی جمہوریت کا تو حال یہ ہے کہ:

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

حضرت شاہؒ صاحب کا تو ایک ہی نعرہ ہے، جو آپؒ کے تاریخی خواب میں مذکور ہے:

وسألونی ماذا حکم اللہ فی ھٰذہ الساعۃ قلت "فکّ کل نظام"

(فیوض الحرمین)

(اور لوگوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے۔ میں نے جواب دیا تمام نظاموں کو توڑ دیا جائے)

"فکُّ کل نظام" آپ کے نظریہ کا سلبی پہلو ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کا ایجابی پہلو کیا ہے؟ سو ان کے نظریہ سیاست کا نچوڑ اس آیت میں موجود ہے۔ اور یہی ان کی دیرینہ آرزو بھی۔

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہٗ علی الدین

کلہٖ ولو کرہ المشرکون ہ (التوبۃ ۳۳)

(وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت اور دین حق دے کر مبعوث فرمایا تاکہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے۔ اگرچہ (اس غلبہ کو) مشرکین ناپسند کریں)

شاہؒ صاحب کا مسلمانوں کے مختلف طبقات کے نام جو پیغام "التفہیمات الالٰھیہ" میں درج ہے اس میں اس آیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔

وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہٗ للّٰہ۔

(البقرۃ — ۱۹۳)

(ان سے جنگ کرتے رہو تاآنکہ فتنہ فرو ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لیے مخصوص ہو جائے)

شاہؒ صاحب کا خیال ہے کہ دین حق کی برتری کے لیے جہاد قیامت تک جاری ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

الجہاد ماضٍ الی یوم القیامۃ

(جہاد قیامت تک جاری ہے)

حجۃ اللہ البالغہ جلد ثانی میں آپ نے صاف صاف تحریر فرما دیا ہے کہ مسلمانوں میں جب تک جہاد کا جذبہ رہا وہ ہر میدان میں غالب و فاتح رہے۔ کامیابی نے ان کے قدم چومے لیکن جب سے یہ جذبہ سرد پڑ گیا اور مسلمانوں نے جہاد کرنا چھوڑ دیا وہ ہر جگہ ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔

التفہیمات الالٰھیہ میں سلاطین اسلام سے جو خطاب درج ہے اس کا یہ اقتباس حضرت شاہؒ صاحب کے نظریات کی وضاحت کر دینے کے لیے کافی ہے۔

"اے بادشاہو! ملاء اعلیٰ کی مرضی اس زمانہ میں اس امر پر قائم ہو چکی ہے کہ تم تلواریں کھینچ لو اور اس وقت تک نیام میں نہ ڈالو جب تک مسلم مشرک سے بالکلیہ جدا نہ ہو جائیں اور اہل کفر و فسق کے قائدین کمزوروں کے گروہ میں جا کر شامل نہ ہو جائیں اور یہ کہ ان میں صلاحیت

ہی باقی نہ رہ جائے کہ آئندہ وہ پھر سر اٹھا سکیں"۔

اگرچہ حضرت شاہؒ صاحب نے (جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے) اپنے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت باطنی کا میدان منتخب فرمایا تھا۔ لیکن خلافت ظاہری کی ضرورت و اہمیت سے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہ ہوئے۔

مرہٹوں اور دیگر کفّار کی جب سرکشی حد سے زیادہ بڑھ گئی تو حضرت شاہؒ صاحب ہی تھے جنھوں نے احمد شاہ ابدالی کو خط لکھا:

"دریں زمان پادشاہی کہ صاحب اقتدار و شوکت باشد...... غیر ملازمان آنحضرت موجود نیست لاجرم برآنحضرت فرض عین است قصد ہندوستان کردن و تسلط کفار مرہٹہ برہم زدن و ضعفائے مسلمین را کہ در دست کفار اسیر اند خلاص فرمودن۔ (شاہ ولیؒ اللہ کے سیاسی مکتوبات خلیق احمد نظامی)

اور اسے بلا کر مرہٹوں کا استیصال کرایا۔

برِصغیر کے مسلمانوں کے حالات کو دیکھ کر حضرت شاہؒ صاحب سمجھ رہے تھے کہ ان کے اقتدار کا چراغ عنقریب بجھنے والا ہے۔ اس لیے ساری زندگی ان کی توجہ اس بات کی طرف مبذول رہی کہ مسلمانوں کی بنیادی فکری اساس کے تحفظ کا انتظام کر دیں تاکہ جب دورِ غلامی آئے تو مسلمان آسانی سے دشمنانِ اسلام کے نظریات کا شکار نہ ہوں۔ حضرت شاہؒ صاحب نے تو ایک عجیب پیشین گوئی فرمائی ہے جسے دیکھ کر شاید مادہ پرست اور اسباب دنیا کے غلام مذاق اُڑائیں۔ لیکن جن کی نگاہیں مسبب الاسباب کی قدرت و اختیار پر مرکوز رہتی ہیں انھیں اس پیشین گوئی کو تسلیم کر لینے میں لمحہ بھر کا بھی توقف نہ ہوگا۔ حضرت شاہؒ صاحب فرماتے ہیں:

والذی اعتقدہٗ انہٗ ان اتفق غلبۃ الھنود مثلا علیٰ اقلیم ھندوستان غلبۃ مستقرۃ عامۃ وجب فی حکمۃ اللہ ان یلھم رؤسائھم التدین بدین الاسلام کما الھم الترک۔

(التفہیمات الالٰہیۃ۔ جلد اوّل)

(میں یہی اعتقاد رکھتا ہوں کہ اگر ایسا اتفاق پیش آیا کہ اقلیم ہندوستان پر (کسی زمانے میں) ہندوؤں کا مستقل تسلط قائم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت اس بات کا تقاضا کرے گی کہ

ان کے سر برآوردہ افراد بعینہٖ اسی طرح اسلام قبول کر لیں جس طرح ترکوں نے کیا تھا)

حضرت شاہؒ صاحب نے مسلمانوں کا صرف اثاثہ ہی محفوظ نہیں کیا بلکہ مدرسہ رحیمیہ کی تربیت گاہ میں ایک انقلابی جماعت کو بھی تیار کر دیا جس نے بعد کے ادوار میں سکھّوں کا مقابلہ کیا اور بالاکوٹ کا معرکہ کارزار گرم ہوا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء میں مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کی۔ پھر ریشمی رومال کی تحریک چلائی، قیامِ پاکستان کے لیے جدوجہد کی اور اب پاکستان میں اسلامی نظامِ حیات کو نافذ کرنے کے لیے سرگرداں ہے۔ حق کے لیے جہاد کا جو جذبہ حضرت شاہؒ صاحب نے پیدا کر دیا تھا الحمد للہ کہ وہ آج بھی زندہ ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک حضرت شاہؒ صاحب کی "ویکون الدین کلہ للّٰہ" کی دیرینہ آرزو پوری نہ ہو جائے۔

عمرانی نظریات

حضرت شاہؒ صاحب کے عمرانی نظریات کی بنیاد ان کا پیش کردہ نظریۂ ارتفاقات ہے۔ ارتفاق رفق سے بنا ہے جس کے معنی نرمی کے ہیں۔ اس سے مراد وہ نفع بخش انتظامات ہیں جو انسانی زندگی کے لوازمات میں سے ہیں۔ "حجۃ اللہ البالغہ" میں حضرت شاہؒ صاحب نے ارتفاقات پر بالتفصیل بحث کی ہے۔

شاہؒ صاحب کے نزدیک انسانی تمدن کے ارتقا (ارتفاقات) کی چار منزلیں ہیں۔

۱۔ ارتفاق اوّل کے مرحلے میں نوع انسانی کے تمام افراد کو جن چیزوں کی یکساں طور پر ضرورت پڑتی ہے مثلاً کھانا، پینا، ستر پوشی کرنا، کھیتی باڑی کرنا، مکان بنانا، جانوروں کو اپنا مطیع بنا کر ان سے رسل و رسائل کا کام لینا، ان کے چمڑے اور اُون سے اپنی ضروریات پوری کرنا، اپنی صنفی خواہشات کی تکمیل اور افزائش نسل کے لیے ایک عورت سے نکاح کر کے اس کو اپنے لیے مخصوص کرنا، ان کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ارتفاق اوّل کی مثال حضرت آدم علیہ السلام کی زندگی

میں ملتی ہے۔

انسان کی بنیادی ضروریات میں اس کے ساتھ دیگر حیوانات بھی کسی نہ کسی درجہ میں شریک ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو مندرجہ ذیل تین ایسی خصوصیات عطا فرمائی ہیں جن کے باعث انسانی معاشرہ دیگر حیوانات سے ممتاز ہو کر ہر لمحہ ارتقا پذیر رہتا ہے۔

۱۔ رفاہیت یعنی وہ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہتا ہے کہ اس سے ایسے اعمال کا صدور ہو جن سے نہ صرف اسی کو فائدہ حاصل ہو بلکہ دوسرے لوگ بھی فائدہ اُٹھا سکیں۔ یہی تخیل اس میں جاہ و جلال اور عزت و شرف کے حصول کی خواہش کو جنم دیتا ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ معاشرہ ایک صالح تمدن کی طرف بڑھتا ہے۔

۲۔ حب جمال: انسانی فطرت دیگر حیوانات کی طرح صرف اپنی ضروریات کو پورا کرنے ہی پر قناعت نہیں کرتی بلکہ ہمیشہ ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

میں اس کا انہماک رہتا ہے جس کے نتیجے میں وہ اپنی ضروریات کی تکمیل کے دوران لطافت، نفاست اور اپنی جمالیاتی حس کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ لذیذ سے لذیذ تر کھانوں، خوبصورت سے خوبصورت تر لباس، خوشنما سے خوشنما تر مکان حاصل کرنے کی خواہش انسانی تمدن کو لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھانے کا سبب بن جاتی ہے۔

۳۔ مادۂ ایجاد و تقلید: انسان میں یہ مادہ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے حیوانات کے برعکس انسان میں ایجاد کا مادہ ہے اور دوسرے افراد میں لوگوں کی ایجادات سے استفادہ کرنے کی صلاحیت ہے۔ اسی طرح سادہ لوح لوگوں کی جماعت میں بعض اوقات کوئی عقلمند، طاقتور، منتظم مزاج، باہمت، عادل اور سخی انسان پیدا ہو جاتا ہے اور لوگ اس کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔ اس طرح معاشرے میں ایک قیادت اُبھرتی ہے اور سب مل کر اپنی اجتماعی کوششوں سے معاشرے کو بام عروج پر پہنچاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انسانوں اور حیوانوں نے تقریباً ایک ہی ساتھ زندگی کا آغاز کیا۔ انسان بھی اپنی بھوک مٹانے کے لیے کمزور جانوروں کو ہلاک کر کے چیر پھاڑ کر کھا لیتا اور حیوان بھی اپنی بھوک مٹانے کے لیے کمزور جانوروں کو ہلاک کر کے کھا لیتے۔ دونوں غاروں اور ماندوں میں پناہ لیتے لیکن آج انسانی سوسائٹی کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور حیوان آج بھی اسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے انھوں نے زندگی کے سفر کا آغاز کیا تھا۔

ارتفاق دوم

حضرت شاہؒ صاحب فرماتے ہیں کہ ارتفاق دوم کی منزل کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی ارتفاق اول کے تجربات کو اپنے مقررہ کردہ معیار کی کسوٹی پر کستی ہے، کھانے پینے، طریق بود و ماند، نشست و برخاست، خلوت و جلوت اور رہائش کی جملہ صورتوں میں جو جو خامیاں تھیں انھیں دُور کرنا اور ان عادات میں تغیر و تبدل کرنا ہے جو اس کی نوع کے تمدنی ارتقا میں مزاحم ہوتی رہی ہیں۔ ایسی غذاؤں کو دُور کرنا جو صحت یا اخلاق کے لیے مُضر ہوں۔ صاف پانی کا استعمال، جسم کی صفائی، برتن کا استعمال، جسم کے ساتھ ساتھ اپنے رہنے کی جگہ کو صاف کرنا، زن و شو کے تعلقات کی استواری، امور خانہ کو بطریق احسن انجام دینا، اولاد کی پرورش و پرداخت، آقا اور خادم کا باہمی تعلق، اپنے اہل قرابت کے ساتھ صلۂ رحمی، کمزوروں اور معذوروں کی امداد وغیرہ وغیرہ۔ ان سارے امور کا تعلق ارتفاق دوم کے دور سے ہے۔

ارتفاق سوم

انسانی معاشرہ جب خاندان اور قبائل کی حدود سے آگے بڑھتا ہے تو ارتفاق سوم کی منزل شروع ہو جاتی ہے۔ مختلف خاندانوں کا ایک قصبہ، شہر اور ملک میں اکٹھا رہنا، ایک قبیلے کے مفادات کا دوسرے قبیلے سے وابستہ ہو جانا، مختلف شہروں میں رہنے والوں کے مابین باہمی اشتراکِ عمل کا پیدا ہو جانا، باہمی لین دین، حکومتوں کا قیام، ہر شہر کی انتظامیہ کا ایک مرکز کے ماتحت ہونا، شہروں کے نظاموں میں یکسانیت

پیدا کرنے کے لیے ملک کا آئین تیار کرنا، ٹیکسوں کو اکٹھا کرنا پھر اُنھیں حسبِ ضرورت ملک کے تمام شہروں میں رفاہیت عامہ کے لیے خرچ کرنا، پورے ملک کے باشندوں کی جان مال، عزت و آبرو کی یکساں طور پر حفاظت، ایک نظام کے تحت پیشوں کی تقسیم و تنظیم، ملک کی سرحدوں کو دشمنوں کے حملے سے محفوظ رکھنا، ملک کے نظام کو چلانے کے لیے عمّال کا تقرر اور پھر ان کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت کا انصرام جرائم کو روکنا، حدود و قصاص کی تنفیذ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا انتظام وغیرہ ان سارے امور کا تعلق ارتفاق سوم سے ہے۔

ارتفاق چہارم

اس ارتفاق کا تعلق اقوام کے باہمی ارتباط (INTERNATIONAL RELATION) سے ہے۔ ایک ملک کی حکومت کا دوسری قوم کی حکومت سے رابطہ قائم ہوتا ہے۔ اگر ایک ملک میں کسی چیز کی قلت ہو اور دوسرے ملک میں وہ چیز بہ افراط پائی جاتی ہو تو ایک نظام کے تحت باہمی لین دین ہوگا۔ ممالک یا صوبہ جات کے درمیان نزاع کی صورت میں ایک قوت حاکمہ ہوگی جو ایک علاقہ کو دوسرے علاقے پر تغلب حاصل کرنے یا دوسرے کا استحصال کرنے سے روکے گی۔ حضرت شاہ صاحب نے اس کے لیے "خلافت" کے عالمگیر و ہمہ گیر نظام کے قیام پر زور دیا ہے۔ اس طرح مختلف علاقوں میں بسنے والی اقوام میں خیر سگالی اور باہمی تعاون کی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔

مختصر یہ کہ شخصی اور انفرادی حیات سے شروع کرکے خاندانی، قومی و ملکی نظام تک پھر ملکی نظام سے بین الاقوامی نظام تک کے تمدنی ارتقا کو حضرت شاہ صاحب نے اپنے بیان کردہ چاروں ارتفاقات میں ضبط کر دیا ہے۔

معاشی نظریات

حجۃ اللہ البالغۃ جلد دوم باب نہم میں حضرت شاہ صاحب نے بالتفصیل اپنے نظریات پیش کیے ہیں (تفصیل کے خواہشمند حضرات رجوع کر سکتے ہیں) ذیل میں حضرت شاہ صاحب کے بیان کردہ معاشی نظریات کے چند اہم نکات پیش کیے

جا رہے ہیں جن سے حضرت شاہ صاحب کے معاشی نظریات کی اساس سمجھ میں آسکتی ہے۔

۱۔ شاہ صاحب زمین اور قدرتی وسائل پیداوار مثلاً معدنیات، کانوں اور چشموں وغیرہ پر لامحدود و غیر مشروط انفرادی ملکیت کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ ان سب کو بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کی ملکیت تصوّر کرتے ہیں اور ان تمام وسائل پر تمام بنی نوع انسان کا یکساں طور پر حق تسلیم کرتے ہیں جن سے ہر شخص انتفاع کر سکتا ہے۔ صرف ضروری یہ ہے کہ وہ شخص بلا کسی کو ضرر پہنچائے اس زمین پر سب سے پہلے قبضہ کرے، شاہ صاحب کے نزدیک زمین کی حیثیت درحقیقت مسجد۔ رباط۔ سرائے اور مسافر خانہ کی ہے جو نمازیوں، مسافروں اور راہگیروں کے لیے وقف ہوتے ہیں اور تمام انسان ان کے اندر شریک ہوتے ہیں۔ جو شخص پہلے آئے گا پہلے حق دار ہوگا۔

۲۔ یہی اصول مُردہ اور بنجر زمین میں بھی ہے یعنی

من احیا ارضا میتۃ فھی لہٗ

(جو مُردہ زمین بنجر کو آباد کرے وہ اُسی کی ہے)

۳۔ یہ ضروری ہے کہ وہ مقبوضہ بنجر زمین شہر اور اس کے قرب وجوار میں واقع نہ ہو تاکہ عامۃ الناس کے مفادات متاثر نہ ہوں۔

۴۔ وہ ملکیت جو زمین پر ابتدائی قبضہ اور آبادکاری کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اس کی ملکیت دائمی اور حقیقی نہیں بلکہ اس کی ملکیت اسی صورت میں جائز تصور ہوگی جب کہ زمین اس کے زیر تصرف و استعمال ہو۔ اس لیے اگر وہ شخص اس کو استعمال میں نہ لا سکے گا تو وہ کسی دوسرے مستحق شخص کو دے دی جائیگی۔

۵۔ زمین سے کسی ایسے استفادہ کو بھی شاہ صاحب جائز تصور نہیں کرتے جو بغیر کسی محنت و مشقت کیا جائے، لہٰذا ایسی تمام جاگیرداریاں یا بڑی بڑی زمینداریاں جو بطور انعام و اکرام یا سیاسی رشوت کے دی گئی ہوں اور ان سے بلا کسی محنت و مشقت کے آمدنی ہو رہی ہو شاہ صاحب کے نزدیک ان کا بھی کوئی جواز نہیں ہے (بلکہ بہتر یہ ہے کہ ایسی زمینوں کو قومی ملکیت میں

لے لیا جاتے)۔

۶۔ شاہ صاحبؒ ملکی معیشت میں سب سے زیادہ زراعت، کان کنی اور چوپانی کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسے پیشوں کو ملک کے لیے زہرِ قاتل تصور کرتے ہیں جو تعیش پسندی، لذت اندوزی، آرائش و زیبائش اور شہوانی خواہشات کی ترغیب و تسکین کا ذریعہ بنیں۔ مثلاً شراب نوشی، اصنام تراشی، امرا کے زیورات میں بے جا تکلفات، لباس کے بناؤ سنگار کے پیشے، عمارات و محلات کی آراستگی، عورتوں کی حسن پرستی، ناچ گانے کی تربیت، مصوری و گل کاری۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب کسی ملک کی اکثریت ان پیشوں میں منہمک ہو جائے گی تو لازمی طور پر ضروری پیشے مثلاً زراعت وغیرہ جیسے پیشے متروک ہو جائیں گے اور امرا کا تعیشات میں انہماک رفتہ رفتہ عوام میں سرایت کر جائے گا جیسے کہ ایران میں ہوا نتیجتاً کسان، تاجر اور اہلِ صنعت و حرفت پر بھاری ٹیکس لگائے جائیں گے تاکہ امرا کے تعیشات کا سامان فراہم کیا جائے اور اس سے ملک کے نظامِ معیشت میں ناقابلِ تلافی اختلال پیدا ہو گا۔

۷۔ حضرت شاہ صاحبؒ سود کو بھی معاشرہ کے لیے مہلک تصور کرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے آگے چل کر بڑے بڑے مناقشات جنم لیتے ہیں اور لوگوں میں بلا کسب کے کھانے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہاں! حضرت شاہ صاحبؒ مضاربت کو جائز قرار دیتے ہیں کہ ایک شخص کا سرمایہ ہو اور دوسرے کی محنت اور آپس کے طے شدہ حساب سے منافع تقسیم کر لیا جائے۔

غرضیکہ نہ شاہ صاحبؒ سرمایہ دارانہ نظام کی اجازت دیتے ہیں جس میں ایک شخص امیر سے امیر تر ہوتا چلا جاتا ہے اور دوسرا غریب سے غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے اور عوام میں غربت و فلاکت، پھر حسد و بغاوت پیدا ہوتی ہے۔ اور نہ موجودہ اشتراکی نظام کا جواز حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریروں سے نکالا جا سکتا ہے۔ کیونکہ شاہ صاحبؒ انفرادی ملکیت کے قائل ہیں اس لیے کہ بلا انفرادی ملکیت کے انسان میں عمل و سعی کا جذبہ ہی نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی جامعیت

حضرت شاہ صاحبؒ اپنی کتاب التفہیمات الالٰہیہ (جلد ۲ ص ۱۴۵ مطبوعہ ۱۳۷۸) میں فرماتے ہیں:

فہمنی ربی جل جلالہٗ انک انعکس فیک نور الاسمین الجامعین، نور الاسم المصطفوی والاسم العیسوی علیہما الصلوات والتسلیمات فعسیٰ ان تکون سادا لافق الکمال غاشیا لاقلیم القرب فلن یوجد بعدک مقرب الاولک دخل فی تربیتہ ظاھرا و باطنا حتی ینزل عیسیٰ علیہ السلام وعسیٰ ان ینزل علیک الحق ما کا لنظام العالم کما تنزل الصاعقۃ فتفک وتقمع کلما۔ تماسہ و یظہر الآیات من بین یدیک ومن خلفک وعن یمینک وعن یسارک ویطلع شمس الحق ساطعۃ وتنمحی کل ظلام عن شرور عالم التخلیط وعسیٰ ان یتم لک ذلک ان تکون الارض نورانیۃ ویذھب عنہا الجور والجفا حتی ترتفع الحاجۃ الی المھدی ویتاخر وجودہ الی مدۃ طویلۃ .... و لکل امر اجل مسمی لایجاوزہ۔

(یعنی مجھے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ الہام سمجھایا کہ تمھارے اوپر دو جامع اسموں کا نور منعکس ہوا ہے یعنی اسم مصطفوی اور اسم عیسوی علیہما الصلوٰت والتسلیمات تو عنقریب کمال کے افق کا سردار بن جائے گا اور قربِ الٰہی کے تمام اقالیم پر چھا جائے گا۔ تیرے بعد کوئی مقربِ الٰہی ایسا نہیں ہو گا جس کی ظاہری اور باطنی تربیت میں تیرا دخل نہ ہو۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں۔ عنقریب تجھ پر حق نازل ہو گا جو نظامِ عالم کو توڑنے والا ہو گا جیسے بجلی گرتی ہے اور ہر اس چیز کو توڑ پھوڑ دیتی ہے جسے وہ چھو دیتی ہے تیرے آگے پیچھے، دائیں بائیں سے اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ظاہر ہوں گی اور حق کا آفتاب طلوع ہو گا جس سے اس دنیا کے شر کا اندھیرا دور ہو جائے گا عنقریب تیرے لیے یہ سب باتیں پوری ہو کر رہیں گی اور زمین نورانی ہو جائے گی اور اس پر سے ظلم و جور دفع ہو جائیں گے یہاں تک کہ (وقتی طور پر) مہدی علیہ السلام کی آمد کی حاجت بھی رفع

ہوجائے گی اور ایک طویل زمانے تک ان کا ظہور مؤخر ہوجائے گا لیکن (یہ یاد رکھو) کہ ہر چیز کا ایک معین وقت ہے جس سے کوئی بھی چیز تجاوز نہیں کرسکتی۔

حضرت شاہؒ صاحب فیوض الحرمین میں فرماتے ہیں:

رأیتنی (وانا بمکۃ) فی المنام قائم الزمان اعنی بذلک ان اللّٰہ اذا اراد شیئا من نظام الخیر جعلنی کالجارحۃ لانمام مرادہ۔

(میں مکہ مکرمہ میں تھا کہ میں نے ایک خواب میں خود کو قائم الزمان دیکھا قائم الزمان سے میری مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی اچھے نظام کے قیام کا ارادہ فرمایا تو اس نے مجھے اس کے لیے "آلہ جارحہ" بنایا (اس کے قیام کا ذریعہ بنایا) تاکہ اس کی مراد پوری ہو)

تفہیمات کے اول الذکر الہام میں حضرت شاہؒ صاحب پر اسم مصطفویؐ اور اسم عیسوی کے انوار کا انعکاس پھر یہ اطلاع کہ تم کمال کے "افق" کے سردار بن جاؤ گے یہاں تک کہ تیرے بعد آنے والا ہر مقرب الٰہی بلاواسطہ یا بالواسطہ تجھ سے اکتساب فیض کرے گا، حضرت شاہؒ صاحب کی جامعیت کی واضح شہادت ہے۔ اسی طرح آپؒ کا خود کو قائم الزمان دیکھنا اور اس بات کی بشارت کہ مراد الٰہی کے لیے آپ کو آلۂ جارحہ بنایا گیا بھی آپ کی جامعیت کی واضح دلیل ہے۔ حضرت شاہؒ صاحب نے نہ صرف اپنے دور کو بلکہ اپنے مابعد کے ادوار کو بھی متاثر فرمایا اور آج تک بالخصوص برِ صغیر پاک و ہند میں جتنی بھی سیاسی، مذہبی، صوفیانہ، نظریاتی، اصلاحی، تمدنی، معاشی، معاشرتی اور علمی تحریکات چلائیں، سب پر حضرت شاہؒ صاحب کا اثر رہا ہے۔ حتیٰ کہ قیام پاکستان اور دو قومی نظریہ بھی شاہؒ صاحب ہی کا مرہونِ منت ہے۔ دو قومی نظریہ اور تحریک پاکستان کو اگر حضرت شاہؒ صاحب کے فیوض الحرمین والے ثانی الذکر خواب کی تفصیلات (جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے) کے مناظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو میرے مذکورہ بالا دعوے کی تصدیق ہوجائے گی، خواب کے اس حصّہ کو کہ وکذٰلک خربنا بلدۃ بعد بلدۃ حتّٰی وصلنا الاجمیر وقتلنا ھنالک الکفار واستخلصنا ھا منھم وسبینا ملک الکفار (الیٰ آخرہ) (یعنی اس طرح شہروں کو برباد کرتے ہم اجمیر پہنچ گئے جہاں ہم نے

کفار کو قتل کیا اور اس شہر کو کافروں سے چھڑا کر ان کے راجہ کو گرفتار کر لیا)

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنے مقالہ تذکرہ حضرت شاہؒ ولی اللہ صفحہ ۶۶ میں پانی پت کی مشہور تاریخی جنگ ۱۱۷۳ھ (جو مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی کے درمیان لڑی گئی) پر محمول کیا ہے۔ فرماتے ہیں: "ٹھیک اس تاریخ سے ۲۹ سال بعد یعنی ۱۱۷۳ھ میں اپنی وفات سے تین سال پہلے اسی شخص نے جس نے گزشتہ بالا واقعات کو خواب میں دیکھا تھا، اپنے سر کی آنکھوں سے وہی شخص ایک اور واقعہ دیکھتا ہے جس میں بجائے اجمیر کے اگر دلّی کا لفظ شامل کر دیا جائے تو تقریباً جو کچھ خواب میں دیکھا گیا تھا بیداری میں کفلق الصبح ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر اسی کا معائنہ کرایا گیا۔ اس سے میرا اشارہ پانی پت کے مشہور فیصلہ کن معرکہ کی طرف ہے۔"

لیکن راقم الحروف کو حضرت مولانا موصوف کی رائے سے اتفاق نہیں ہے اس لیے کہ خواہ مخواہ "اجمیر" کو دہلی پر محمول کرنا، کسی بات کا اپنے حقیقی معنوں پر منطبق ہوتے ہوئے معنی مجازی پر محمول کرنے کے مترادف ہے جو درست نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خواب کے اگلے حصّہ میں آتا ہے وسألونی ماذا حکم اللّٰہ فی ھذہ الساعۃ" قلت فک کل نظام (چنانچہ ان لوگوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے؟ میں نے کہا تمام بوسیدہ نظاموں کو توڑ دو) اگر اس خواب کے واقعہ کا پانی پت سے تعلق مانا جائے تو سوال پیدا ہوگا کہ "فک کل نظام" کب ہوا؟ اس لیے کہ احمد شاہ ابدالی کے واپس جانے کے بعد تو پھر وہی سابقہ فرسودہ نظام شاہنشاہی اپنی تمام ترلغویتوں کے ساتھ لوٹ آیا۔ فک کل نظام کا اگر مطلب صرف بوسیدہ نظاموں کے توڑ دینے سے لیا جائے تو بات مکمل نہیں ہوگی، اس لیے کہ حضرت شاہؒ صاحب فک کل نظام کے بعد "ویکون الدین کلہ للّٰہ" کے داعی ہیں جو اس کے بعد سے اب تک برِ صغیر پاک و ہند میں تو نہیں ہوا۔ اس لیے راقم الحروف کا خیال ہے کہ حضرت شاہؒ صاحب کے خواب کو ابھی شرمندۂ تعبیر ہونا باقی ہے اور انشاء اللہ ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب کہ بعینہٖ وہی واقعات پیش آئیں گے جو حضرت شاہؒ صاحب نے خواب میں دیکھے تھے۔ اجمیر کا استخلاص بھی

ہو گا۔ فک کل نظام بھی ہو گا اور پھر برصغیر کے گوشہ گوشہ میں باطل نظاموں کے ٹوٹ جانے کے بعد "خالص اسلامی نظام" قائم ہو گا۔ (انشاء اللہ العزیز) یہ کب ہو گا؟ کیسے ہو گا؟ اس کا جواب مستقبل دے گا۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ جو نظام خیر نافذ ہو گا وہ حضرت شاہ صاحبؒ کی تعلیمات سے مستفاد ہو گا۔ التفہیمات الالٰہیہ (ج ۱: ۱۰۱-۱۱۲) میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی ذات کے بارے میں "وصی" اور "مجدد" ہونے کا اشارہ فرمایا ہے اور چند نہایت اہم امور بتلائے ہیں۔ ذیل میں ان کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے:

"حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں سحر اور جادو کا بڑا چرچا تھا تو خدا تعالیٰ نے آپؑ کو ایسا معجزہ عطا فرمایا جس نے تمام ساحروں کو جھکنے پر مجبور کر دیا یعنی عصا اور یدِ بیضا کا معجزہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں شاعری اور خطابت کا زور تھا تو آپؐ کو قرآن کریم کا معجزہ عطا فرمایا گیا جس نے تمام فصحائے عرب کو عاجز کر دیا۔ یہی حال مجددین اور اوصیا کا ہے کہ قوموں کے اختلاف کے ساتھ امر تجدید اور صورت تجدید میں بھی اختلاف ہوتا ہے لہٰذا اگر قوم میں خطابت شائع و ذائع ہو گی تو اس دور کا مجدد شریعت کی تفسیر خطابت کے پیرایہ میں کرے گا اور اگر "دلیل و برہان" کا رواج ہو گا تو اس دور کا مجدد "برہان کی زبان" میں شریعت کی تفسیر بیان کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کے اس وصی (حضرت شاہ صاحبؒ) نے اپنے زمانے میں تین چیزیں پائی ہیں (۱) برہان یونانیوں کے علوم کے اختلاط کی وجہ سے (۲) وجدان عوام میں اہل تصوف کی مقبولیت کے باعث (۳) سمع (منقولات) بحث و مناظرہ اور متشابہات میں لوگوں کے خوض کے سبب سے۔

تم ہر آدمی کو دیکھو گے کہ وہ احکام کے معانی و اسرار سمجھنے کے درپے ہے۔ اس طرح جدل و مناظرہ اور مباحثے کا بازار گرم ہو گیا۔ فقہ میں بھی لوگوں نے اختلاف کیا۔ ان میں کوئی حنفی ہے کوئی شافعی اور ہر ایک اپنے مسلک اور حاملین مسلک کے بارے میں متعصب ہو گیا ہے۔ تخریجات کی کثرت ہو گئی اور حق پوشیدہ ہو چکا ہے۔ اس وصی پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت یہ ہے کہ اگر یہ سارے متحارب و باہم متخالف گروہ (میری) پیش کردہ شریعت کی تفسیر پر غور کریں تو سارے اختلافات رفع ہو جائیں گے۔ اس وصی (شاہ صاحبؒ) کی پیش کردہ (شریعت کی تعبیرات) برہان، وجدان

اور منقول سب پر منطبق ہوتی ہیں۔ یہ وصی قوم کے علوم کا واقف اسرار اور حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے والی کسوٹی ہے۔ اگر امور اس وصی (شاہ صاحبؒ) کے افکار کو سپرد کر دیے جائیں تو وہ فلسفی سے اپنے فلسفے کے ذریعہ، متکلم سے اپنے کلام کے ذریعہ، محدث سے اپنی حدیث کے ذریعہ، مفسر سے اپنی تفسیر کے ذریعہ، فقیہ سے اپنی فقہ کے ذریعہ، نحوی سے اپنی نحو کے ذریعہ اور صوفی سے اپنے تصوف کے ذریعہ گفتگو کرے گا اور ہر ماہر فن کو عاجز و مبہوت کر دے گا۔ یہ وصی ان کو وہ باتیں بتلائے گا جن سے وہ واقف نہیں اور ان اسرار کی نشان دہی کرے گا جو ان پر ہنوز پوشیدہ ہیں۔"

حضرت شاہ صاحبؒ کے یہ دعاوی محض دعاوی نہیں ہیں بلکہ آپؒ نے صرف اپنے ۲۸ سالہ تصنیفی دور میں علوم و معارف کا وہ انمول گنجینہ تیار فرما دیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ علوم متداولہ کے علاوہ بہت سارے ایسے علوم ہیں جو حضرت شاہ صاحبؒ کی ایجاد کہے جا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر عرصہ دراز تک فحول علما کی ایک جماعت علوم کا سرمایہ مدون کرنا چاہے تب بھی وہ اتنا کام انجام نہیں دے سکتی جتنا کہ محض ایک فرد واحد کی نوک قلم نے انجام دے دیا۔ اس کو سوائے فیض الٰہی اور فضل خداوندی کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

یہی وجہ ہے کہ ایک محقق عالم مولانا شبلی اپنی کتاب علم الکلام کے صـ ۸۷ (مسعود پبلشنگ ہاؤس کراچی ۱۹۶۴ء) پر فرماتے ہیں:

"ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انھیں کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا، اس کے لحاظ سے یہ امید نہیں رہی تھی کہ پھر کوئی صاحب دل و دماغ پیدا ہو گا۔ لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھلانا تھا کہ اخیر زمانے میں جب کہ اسلام کا نفس باز پسیں تھا شاہ ولی اللہؒ جیسا شخص پیدا ہو جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی اور ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔"

شیخ محمد عاشقؒ الخیر الکثیر کے دیباچے میں فرماتے ہیں۔

"راہِ طریقت طے کرنے والوں اور طالبانِ حقیقت پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ

خداوند تعالیٰ کسی کامل انسان کو اپنے علوم و اسرار کے ظاہر کرنے کا ذریعہ بناتا اور اسے بطور اپنے آلۂ کار استعمال کرتا ہے اور اس کی زبان سے کلام کرتا ہے ...... اس زمانے میں اس بلند مقام پر قطب الدین احمد ابو الفیاض ولی اللہ فائز ہیں جو محدثین میں سب سے بڑے محدث۔ اپنے دور کے ولی و لسان اللہ ہیں۔

مولانا اسماعیل شہید دہلوی عبقات میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"تحقیق کرنے والوں میں سب سے افضل، نکتہ بینوں کے سرمایۂ افتخار، حکما کے دستگیر۔ عارفین کے امام اور سب سے بڑے خداشناس شیخ ولی اللہ، اللہ تعالےٰ ہمیں ان کی برکتوں سے بہرہ اندوز کرے۔"

حضرت میرزا مظہر جان جاناںؒ فرمایا کرتے تھے۔

"حضرت شاہ ولی اللہؒ نے (تصوف کا) نیا طریقہ بیان کیا ہے اور وہ خداشناسی کے راز کھولنے اور علوم کی باریکیاں بیان کرنے میں خاص طرز کے مالک ہیں علوم ظاہری میں مہارت تامہ رکھنے کے ساتھ ہی شاہ صاحب علمائے ربانی میں سے ہیں۔ محقق صوفیوں میں جو ظاہری اور باطنی علوم کے ماہر ہوں اور جنھوں نے علم کے راز بیان کرنے میں نئی ڈگر اختیار کی ہو، ایسے چند ہی بزرگ گزرے ہیں۔"

(بحوالہ جبیدیہ ترجمہ رسالہ محمودیہ ص۴۳)

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی فرماتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں اللہ تعالیٰ دو شخصوں کو پیدا نہ کرتا اور ان سے اپنے دین کی دستگیری نہ فرماتا تو یوں تو اللہ تعالیٰ اپنے دین کا نگہبان ہے اور اس کی حفاظت دین کے ہزار طریقے ہیں، لیکن بظاہر تیرھویں صدی تک یا تو اسلام ہندوستان سے بالکل فنا ہو جاتا یا اتنا بگڑ جاتا جتنا ہندو مذہب۔ یہ دو بزرگ ہندوستان کے مسلمانوں کے جلیل القدر محسن اور اسلام کے عظیم الشان پیشوا حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔"

(سیرت احمد شہید۔ جلد اوّل صفحہ ۳۶۔ مطبوعہ خواجہ بکڈپو۔ لاہور)

حضرت شاہؒ صاحب کی خصوصیات

شاہؒ صاحب نے اپنی مختلف تصانیف میں تحدیث نعمت کے طور پر ان کمالات جلائل اعمال اور خصوصیات کا تذکرہ فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا فرمائی تھیں ملخصاً ان کو ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ حضرت شاہؒ صاحب کو قائم الزمان بنایا گیا۔

۲۔ آپؒ کو خلعت فاتحیت عطا کیا گیا اور آخری دور کا آغاز آپؒ کے ہاتھ سے کرایا گیا۔

۳۔ آپؒ کو مجدد دین قویم بنایا گیا۔

۴۔ وصی ہونے کی وجہ سے آپؒ اللہ تعالیٰ کی مرضیات کی تکمیل کے لیے آلۂ جارحہ بنائے گئے۔

۵۔ آپؒ نے احکام شریعت کے اسرار و مصالح بیان فرمائے اور بقول شاہؒ صاحب "ان تمام کے اسرار و رموز کا بیان ایک مستقل فن ہے جس کے بارے میں اس فقیر سے زیادہ وقیع بات کسی اور سے نہیں بن آئی ہے۔ اگر کسی کو اس فن کی عظمت و بلندی کے باوجود میرے بیان میں شبہ گزرے تو اسے شیخ عز الدین ابن عبد السلام کی کتاب قواعد کبریٰ دیکھنی چاہیے جس میں انھوں نے کس قدر زور مارا ہے مگر پھر بھی وہ اس فن کے عشر عشیر تک نہیں پہنچ پائے"

(ترجمہ الجزء اللطیف انفاس العارفین ص۴۰۶)

۶۔ آپؒ کو سلوک طریقت الہام کیا گیا اور آپؒ نے وہ طریق پیش کیا جو صوفیا کے غلو سے پاک اور جادۂ شریعت کا پابند تھا۔

۷۔ آپؒ نے قدیم علمائے اہل سنت کے عقائد کو دلائل و براہین کی روشنی میں اس طرح ثابت کیا اور انھیں اس طرح معقولیوں کے شکوک و شبہات سے پاک کیا کہ اب ان پر مزید بحث کی گنجائش نہیں رہ گئی۔

۸۔ آپؒ کو کمالات اربعہ (ابداع خلق، تدبیر اور تدلی (تجلی) کی حقیقت اور نفوس انسانیہ کی استعداد کا خصوصی علم عطا کیا گیا۔ مذکورہ بالا دونوں علوم آپؒ سے پہلے کسی عالم

کو نہیں دیے گئے اور نہ کسی نے ان پر کماحقہ کلام کیا۔

۹۔ آپؒ کو حکمتِ عملی یعنی تدبیر معاشیات، سیاسیات و عمرانیات کے شرعی اصول و ضوابط سمجھائے گئے اور کتاب و سنت و آثار صحابہؓ کے ساتھ ان کو تطبیق دینے کی توفیق بخشی گئی۔

۱۰۔ آپؒ کو جامعیت بخشی گئی (تفصیلات گزر چکی ہیں)

۱۱۔ بقول شاہؒ صاحب

"اس پر مستزاد یہ کہ مجھے ایک ملکہ عطا کیا گیا جس کی بدولت میں تمام عقائد و اعمال، اخلاق و آداب کے متعلق یہ تمیز کر سکتا ہوں کہ دین حق کی اصلی تعلیم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہے وہ کیا ہے اور وہ کون سی باتیں ہیں جو بعد میں دین حنیف کے ساتھ چسپاں کر دی گئیں اور کسی بدعت پسند فرقہ کی تحریف، غلو و افراط یا تہاون و تفریط کا نتیجہ ہیں"

۱۲۔ آپ کو "الجمع بین المختلفات" کا خصوصی علم دیا گیا۔

۱۳۔ آپ نے سب سے پہلے علمائے معاصرین کی مخالفت کے باوجود قرآن کریم کا بلند پایہ ترجمہ پیش کیا۔

۱۴۔ آپؒ نے احادیث کی حیثیات کا تعین کیا اور درس حدیث میں تحقیق کی بنیاد ڈالی۔

۱۵۔ آپؒ کو علم المصالح والمفاسد اور علم الشرائع والحدود دونوں دیے گئے اور بقول شاہؒ صاحب "یہ وہ علم شریف ہے جس کے متعلق بیان کرنے اور اس کے اصولوں کو واضح کرنے نیز مسائل کی تطبیق میں مجھ پر کسی نے سبقت نہیں کی"

کچھ ترجمہ کے بارے میں

سطعات جیسی اہم، دقیق اور مہتم بالشان کتاب کا ترجمہ اور تشریح درحقیقت میرے بس کی چیز نہیں تھی۔ بات اصل میں یہ ہے کہ مجھے حضرت شاہؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ عقلیت پسند دور میں اگر حضرت شاہؒ صاحب کی تعلیمات

کو صحیح طور پر نہ پیش کیا گیا تو ہم اپنی نئی پود کے ذہن میں اُبھرنے والے شکوک کو رفع نہیں کر سکیں گے۔ شاہؒ صاحب قائم الزمان ہیں۔ یہ دور شاہؒ صاحب کا دور ہے۔ اس لیے ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ان کے افکار کو ہر ممکن تسہیل کے ساتھ پیش کیا جائے۔ میرے پاس نہ فکری سرمایہ ہے اور نہ علمی۔ شاہؒ صاحب کی عقیدت کی مشعل لے کر اللہ پر توکل اس وادی میں میں نے قدم رکھ دیے۔ پتا نہیں میں کامیابی سے اس سفر کو طے کر سکا ہوں یا نہیں؟ اتنا یاد ہے کہ

بسینہ می سپرم راہ گرچہ پاخفتہ است

ترجمہ حتی المقدور لفظی کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس لیے کہ یہ ایک فنی کتاب ہے، اگر عبارت آرائی کا خیال کیا جاتا تو ممکن تھا کہ حضرت مصنفؒ کی مراد سے دور جا پڑتے۔ البتہ تعلیقات میں توضیح اور تفہیم کی بھرپور کوشش کی گئی ہے (واللہ ھو الموفق والمعین) دوران ترجمہ حضرت شاہؒ صاحب کی مصنفات بالخصوص حجۃ اللہ البالغۃ۔ البدور البازغہ۔ لمحات۔ التفہیمات الالٰہیہ۔ الفوز الکبیر۔ الخیر الکثیر۔ الطاف القدس۔ فیوض الحرمین۔ انفاس العارفین اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی عبقات پیش نظر رہی ہیں۔ میں نے مولانا عبیداللہؒ سندھی کے ان امالی سے بھی استفادہ کیا ہے جنھیں مولانا بشیر احمد لدھیانوی مرحوم نے حضرت مولانا سندھی سے اخذ کیا اور میں مولانا محمد مقبول عالم صاحب بی اے، جائنٹ سیکرٹری شاہ ولی اللہ سوسائٹی پاکستان کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ان امالی کی نقل فراہم کی۔ میں جناب کرنل خواجہ عبدالرشید چیئرمین دیال سنگھ لائبریری لاہور اور جناب محمد سعید شیخ ڈائرکٹر ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اول الذکر نے سب سے پہلے مجھے اس کام کی طرف متوجہ فرمایا اور میری ہمت افزائی فرمائی اور جناب شیخ صاحب نے اپنے شدید اصرار اور تقاضے سے مجھے مجبور کر دیا کہ اس کام پر لگ جاؤں اور بعونہ تعالیٰ اس کی اشاعت کا انتظام فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

میں نہیں کہتا کہ غلطیوں سے مبرا ہوں۔ ممکن ہے کہ اہل بصیرت حضرات ترجمے یا تشریحات میں کوئی غلطی پائیں۔ میں بے حد شکر گزار ہوں گا اگر غلطی سے مجھے مطلع کر دیا جائے گا۔

کتاب کا مقدمہ کسی حد تک طویل ہو گیا ہے لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی کتب اور ان کتابوں سے وسیع استفادہ کرکے جو آپ کے افکار و تعلیمات پر لکھی گئی ہیں، حضرت شاہ صاحب کے حالات اور آپ کے افکار کا خلاصہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر دوں۔ شاہ صاحب کی شخصیت تو ایک اتھاہ سمندر ہے اُن کے افکار کا کیا کہنا۔ اس لیے باوجود انتہائی ایجاز و اختصار کے مقدمہ میں طوالت پیدا ہو گئی۔ اس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ حواشی زیادہ طویل ہو گئے ہیں، ان کا متعلقہ صفحہ پر آنا مشکل تھا۔ للذا ہر سطعہ کے آخر میں دے دیے گئے ہیں۔

آخیر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور ہماری نئی نسل کو اسلام کا صحیح فہم عطا فرمائے۔ آمین۔ تاکہ

فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے

والصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقہٖ محمّدٍ وآلہٖ وصحبہٖ اجمعین برحمتك یا ارحم الراحمین۔

العارض ــــ سیّد محمد متین ہاشمی

۱۹ر دسمبر ۷۵ء